پنج آہنگ

آہنگ پنجم کے
فارسی خطوط کا ترجمہ

محمد عمر مہاجر

ادارہ یادگار غالب کراچی

(آہنگِ پنجم)

غالب کے فارسی خطوط کا ترجمہ

محمد عمر مہاجر

ناشر ——— مرزا ظفر الحسن
معتمد عمومی ادارۂ یادگارِ غالب۔ کراچی

چھپائی ——— آفسٹ

تعداد ——— گیارہ سو

اشاعت کی تقریب ——— غالب کی صد سالہ برسی

ماہ و سال ——— مارچ ۱۹۶۹ء

مطبع ——— ایجوکیشنل پریس۔ کراچی

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ (۱۷۹۷ء - ۱۸۶۹ء) کے فارسی خطوط کا ترجمہ ہے۔ یہ خطوط غالبؔ نے ۱۸۲۶ء اور ۱۸۲۸ء کے درمیان مختلف احباب و مشاہیر کو لکھے تھے۔ اور مصنف کی زندگی ہی میں پنج آہنگ کی آہنگِ پنجم کے طور پر شائع ہوئے تھے۔

پنج آہنگ غالبؔ کی فارسی نثر کا پہلا مجموعہ تھا۔ اسے غالبؔ کے دوست اور نسبتی بھائی مرزا علی بخش خان نے مُرتب کیا اور ایک دیباچہ بھی لکھا تھا۔ پنج آہنگ کے پانچ باب ہیں۔ پہلے باب میں وہ آداب و القاب درج ہیں جو اُس زمانے میں عام طور پر خط و کتابت میں استعمال ہوتے تھے۔ دوسرے باب میں فارسی کے مصادر اور مصطلحات و لغات ہیں۔ تیسرے باب میں غالبؔ کے چند فارسی اشعار نقل کئے گئے ہیں تاکہ اُن سے مکاتبات کا لطف افزوں ہو جائے۔ چوتھے باب میں غالبؔ کے دیباچے اور تقریظیں ہیں اور پانچویں باب میں اُن کے خطوط۔

غالبؔ نے اِس مجموعے کی شانِ نزول بیان کرتے ہوئے تمہید میں لکھا ہے کہ ۱۸۲۵ء میں جن دنوں انگریزوں نے ریاست بھرت پور پر لشکر کشی کی تھی تو مَیں اس یورش میں نواب احمد بخش خان (والیِ فیروزپور جھرکا و لوہارو) کا رفیق اور مرزا علی بخش خاں، نواب صاحب کے بھتیجے، کا ہم سفر تھا۔ ہم دونوں ہر شب

ایک ہی خیمے میں قیام کرتے تھے۔ برادر علی بخش کو فروغِ دانش کی جستجو رہتی ہے۔ انہوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں خطوط نویسوں کی سہولت کے لئے القاب و آداب اور شکر و شکوہ اور شادی و غم کے متعارفہ اور رسمی الفاظ تحریر کر دوں۔ گو اس روش سے بیگانگی میرا شیوہ ہے لیکن مجھے اپنے عزیز کی خاطر منظور تھی۔ پس یہ اوراق یعنی آہنگ اول تین دن میں مکمل ہوئے۔

مرزا علی بخش دیباچے میں لکھتے ہیں کہ نواب شمس الدین خان (خلف اکبر نواب احمد بخش خاں) کے پھانسی پانے کے بعد (۱۸۳۵ء) جن دنوں میں مرزا غالب کے مکان پر دہلی میں قیام پذیر تھا تو موصوف نے انہیں دنوں اپنا فارسی دیوان مسمیٰ بہ "میخانۂ آرزو" مرتب کیا تھا۔ اس میں مرزا غالب کی بعض نثری تحریریں بھی شامل تھیں۔ میرے دل میں آئی کہ اس دیوان میں شامل شدہ تمام نثر کو یکجا کر دوں اور غالبؔ کی دوسری متفرق تحریروں کو بھی اس میں شامل کر لوں۔ لیکن ہجومِ افکار اور وفورِ آلام کی وجہ سے فرصت نہ ملی یہاں تک کہ حکیم رضی الدین حسن خاں کا ارشاد اس کام کا محرک ہوا اور میر محمد حسین خان نے جو ان نثری تحریروں کے پڑھنے میں میرے شریک تھے میرے عزم کو پختہ کیا۔ پھر مجھے یہ خواہش بھی ہوئی کہ میرا بیٹا غلام فخر الدین ان تحریروں سے استفادہ کر سکے۔

نکاتِ غالبؔ کے دیباچے میں جو فروری ۱۸۶۸ء کی تحریر ہے غالب نے پنج آہنگ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ۔

"اس زمانے سے تیس برس پہلے (۱۸۳۷ء) میں نے اپنی نثریں جمع کیں اور اس کا نام پنج آہنگ رکھا۔ آہنگ لغتِ فارسی ہے

اور اس کے دو معنی ہیں۔ قصد و آواز۔ چونکہ وہ مجموعہ پانچ ابواب کا
ہے یعنی باب کو آہنگ قرار دیا ہے۔ یہ لغت دونوں معنوں کی رُو سے
بجائے باب سزاوار اور بجا ہے۔ چالیس برس کی عمر میں وہ رسالہ لکھا
ہے۔ اب ۳۱ برس کے بعد یہ ارادہ کیا ہے کہ پنج آہنگ کی چوتھی آہنگ
جس میں فارسی کی صرف کا بیان ہے اُس کا اُردو میں ترجمہ کیا جائے

؎ مجموعہ نثر غالب اُردو مرتبہ خلیل الرحمان داؤدی
مجلس ترقی ادب لاہور۔ صفحہ ۱۸۴

اِس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ غالب نے اپنی فارسی نثریں خود جمع کی تھیں
اور مجموعے کا نام پنج آہنگ بھی انہیں کا رکھا ہوا ہے۔ یہ قلمی نسخہ غالباً انہوں نے
نواب ضیاء الدین خان نیّر و رخشاں کے حوالے کر دیا تھا۔ چنانچہ منشی شیو نرائن کے
نام ایک خط میں ۱۱ دسمبر ۱۸۵۸ء کو لکھتے ہیں۔

"ضیاء الدین خان جاگیردار لوہارو میرے سگے بھائی اور میرے
شاگرد رشید ہیں۔ جو نظم و نثر میں میں نے کچھ لکھا وہ انہوں نے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ
کلیات نظم فارسی۔ چوتن پچین جزو اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز اور دیوان ریختہ
سب مل کر سو سوا سو جزو مطلا و مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ کوئی
ڈیڑھ سو دو سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب یکجا
فراہم ہے۔ پھر ایک شاہزادے نے اِس مجموعۂ نظم و نثر کی نقل لی۔ اب دو جگہ
میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لٹے۔ وہ دونوں جگہوں کا کتاب خانہ
خوان یغما ہو گیا۔ ہر چند میں نے آدمی دوڑائے۔ کہیں اُن میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔"

(خطوط غالب مرتبہ مہر صفحہ ۲۴۳)

پنج آہنگ پہلی بار مطبع سلطانی دہلی میں ۱۸۴۹ء میں چھپی (مجموعۂ نثر اردو، صفحہ ۴۱۴) یہ وہی نسخہ تھا جسے مرزا علی بخش نے مرتب کیا تھا۔ مولانا غلام رسول مہر نے غالب کے تتبع میں مطبع کا نام "بادشاہی چھاپہ خانہ" لکھا ہے (غالب ص ۴۱۲) مگر سن طباعت نہیں بتایا ہے۔ دوسرا اڈیشن ۱۸۵۳ء میں منشی نورالدین کے مطبع دارالسلام دہلی میں چھپا۔ لیکن دونوں طباعتیں نہایت ناقص تھیں چنانچہ غالب نے ۱۱ دسمبر ۱۸۵۸ء کو منشی شیو نرائن کے خط میں اس بات کی شکایت کی ہے۔

"پنج آہنگ تم نے مول لے لی۔ اچھا کیا۔ دو چھاپے خانے ہیں۔ ایک بادشاہی چھاپے خانے کا اور ایک منشی نورالدین کے چھاپے خانے کا۔ پہلا ناقص اور دوسرا سراسر غلط ہے۔"

صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں۔

"ہاں چھاپے خانے کی پنج آہنگیں اب بھی بکتی ہیں اور معیوب بہ دو عیب ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو بعد انطباع از قسم نثر تحریر ہوا ہے وہ اس میں نہیں۔ دوسرے کاپی نویس نے وہ اصلاح میری نثر کو دی ہے کہ میرا جی جانتا ہے۔ اگر کہوں کوئی سطر غلطی سے خالی نہیں تو اغراق ہے۔ بے مبالغہ یہ ہے کہ کوئی صفحہ اغلاط سے خالی نہیں۔"

(خطوط غالب مرتبہ مہر صفحہ ۵۰۰)

پنج آہنگ تیسری بار نولکشور پریس لکھنؤ سے جنوری ۱۸۶۰ء میں طبع ہوئی۔ غالب نے منشی نولکشور کے خط کے جواب میں ۱۸ جولائی ۱۸۶۰ء کو فارسی میں

لکھا تھا کہ۔

"میری فارسی نثر کی تین کتابیں ہیں۔ پنج آہنگ، مہرِ نیمروز اور دستنبو۔ ممکن ہے کہ ان کتابوں کے نسخے اہلِ لکھنؤ کے پاس موجود ہوں۔ اگر فارسی نگارش کو دیکھنے کا شوق ہے تو پھر ان کتابوں کو فراہم کیوں نہیں کرتے؟"

یہ ایک لطیف اشارہ تھا منشی نولکشور کو ان کتابوں کی طباعت پر آمادہ کرنے کی طرف۔ منشی نولکشور نے اُس وقت تو مرزا کی تجویز پر توجہ نہ دی لیکن ۱۸۶۳ء میں جب وہ دہلی گئے اور غالبؔ سے ملے تو غالبؔ کے کلیاتِ نثرِ فارسی کی طباعت پر راضی ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے نواب ضیاء الدین خاں نیّر و رخشاں سے پنج آہنگ کا ایک نسخہ بھی حاصل کیا اور اپنے ہمراہ لکھنؤ لے گئے (ملاحظہ ہو خاتمۂ پنج آہنگ تحریرِ غالبؔ صفحہ ۲۵۴۔ نولکشور پریس) مگر غالبؔ کی تحریر سے یہ نہیں پتا چلتا کہ وہ کوئی مطبوعہ نسخہ تھا جو بعد تصحیح منشی نولکشور کو دیا گیا یا نیّر و رخشاں کے کتب خانے کا کوئی قلمی نسخہ تھا البتہ "کلام نامطبوع" سے یہ ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ نواب ضیاء الدین خاں ۱۸۵۷ء کی تباہی کے بعد غالبؔ کی تحریریں دوبارہ جمع کرنے لگے تھے۔ بہرحال اس نسخے میں وہ خطوط بھی شامل تھے جو غالبؔ نے ۱۸۵۷ء کی اشاعت کے بعد لکھے تھے۔ مگر منشی نولکشور نے کلیاتِ نثرِ فارسی کا یہ مسوّدہ پانچ سال تک نہ چھاپا۔ اس تاخیر کا باعث غالباً یہ خیال تھا کہ غیر مطبوعہ خطوط زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمع ہو جائیں گے تو کتاب کی اہمیت اور بڑھ جائے گی۔

غالبؔ کی حیات میں پنج آہنگ کا یہ آخری ایڈیشن تھا۔ اس ایڈیشن میں باعتبارِ سن سب سے آخری خط شہزادہ سلطان محمد بہادر میسوریہ کے نام ہے جو

غالباً ۱۸۶۶ء میں لکھا گیا تھا۔

"اکنوں کہ عمر گذران بہ ہفتاد رسید چناں بہ خاطر ناشاد رسید کہ مسودہ ہائے بچاہ سالہ تحریر فراہم کردم"۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب آخر عمر تک بعض اشخاص کو خط فارسی میں لکھتے تھے اور نقل منشی نولکشور کو بھیجتے جاتے تھے۔

نولکشوری نسخہ کی طباعت کے ایک سال بعد غالب کا صریر خامہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

مرزا غالب رواج زمانہ کے مطابق پچاس باون برس کی عمر تک تمام خط و کتابت فارسی ہی میں کیا کرتے تھے چنانچہ ان کا ۱۸۴۸ء سے پیشتر کا کوئی خط اردو میں اب تک نہیں ملا ہے۔

ان خطوط کی تعداد جو پنج آہنگ کے نولکشوری ایڈیشن میں شامل ہیں اندازے کے مطابق ۱۸۰ ہے۔ ان کے علاوہ مولانا امتیاز علی عرشی رامپوری نے ۴۳ فارسی خطوط "متفرقات غالب" کے نام سے ۱۹۴۷ء میں شائع کئے ہیں۔ مولانا عرشی نے غالب کے چند خطوط کی اصل کا مقابلہ پنج آہنگ کی مطبوعہ عبارتوں سے بھی کیا ہے۔ اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ غالب نے پنج آہنگ کی طباعت کے وقت خطوں کی اصل عبارت میں کئی مقامات پر تغیر اور ترمیم کی ہے۔ کہیں الفاظ اور فقرے بدلے ہیں کہیں عبارتوں میں اضافہ کیا ہے۔ کہیں عبارت کو مختصر کر دیا ہے اور کہیں اصل مضمون ہی کو حذف کر کے دوسرا مضمون لکھ دیا ہے۔

(ماہ نو۔ کراچی جنوری، فروری ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۹۸)

اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوں گے کہ مرزا غالب نے پنج آہنگ کے نسخہ کو بھی بہت احتیاط سے اشاعت کے لئے مرتب کیا تھا اور اپنی تحریروں میں اصلاح و تزئین کرتے وقت مصلحت کے تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا تھا کیونکہ نجی خطوں میں انسان بعض اوقات ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جن کا مکتوب الیہ کے علاوہ دوسروں کی نظر سے گذرنا مناسب نہیں ہوتا۔

غالبؔ کے طرز انشا سے بحث کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خط و کتابت کا جو نفیس اسلوب مرزا نے تیس برس بعد (۱۸۵۰ء) اردو زبان میں اختیار کیا، اور جس سے ان کے اکثر فارسی خطوط عاری ہیں، اُس وقت بھی (۱۸۲۵ء) انہیں پسند خاطر تھا" اس کے ثبوت میں انہوں نے آہنگ اوّل سے غالبؔ کی یہ عبارت نقل کی ہے۔

مکتوب الیہ را بہ لفظے کہ فراخور حال اوست آواز دہم و زمزمہ سنج مُدعا گردم۔ القاب و آداب گوئی و عافیت جوئی حشو زاید است۔ و بخنگان حشو را دفع نہند۔ نامہ نگار را باید کہ نگارش را از گذارش دور تر نہ بُردہ، نبشتن را رنگ گفتن دہد۔

اور پھر نوٹ میں لکھا ہے۔

"بعض نقاد مرزا کے اسلوب مکتوب نویسی کو سفر کلکتہ کی سوغات اور فورٹ ولیم کالج کا عطیہ سمجھتے ہیں۔ کاش وہ ان سطور کو دیکھ لیتے جو مکتوب نویسی اور انداز تحریر کے متعلق غالبؔ نے سفر کلکتہ سے تین سال پہلے لکھیں۔

(حیاتِ غالبؔ صفحہ ۹۲)

یہ درست ہے کہ مرزا غالبؔ نے آہنگ اوّل اور دوم مرزا علی بخش
کی فرمائش پر ۱۸۲۵ء میں لکھیں لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ رسالے کی
تمہیدی سطریں بھی ۱۸۲۵ء کی تحریر ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ غالبؔ نے پنج آہنگ کو طباعت
کے لئے مرتب کرتے وقت یہ تمہیدی سطریں ۱۸۴۸ء یا ۱۸۴۹ء میں لکھی ہوں۔ ہم اوپر بتا
چکے ہیں کہ غالبؔ نے پنج آہنگ کے خطوط میں طباعت کے وقت متعدد مقامات پر
اضافے اور تبدیلیاں کی ہیں۔ پس کیا عجب ہے کہ انہوں نے تمہید طباعت کے وقت
لکھی ہو یا اس میں حسب عادت اضافے اور تبدیلیاں کی ہوں۔ اگر ہم شیخ صاحب کا یہ
دعویٰ تسلیم کر لیں کہ غالبؔ نے خطوط نویسی کے وہ اصول جس پر وہ فارسی میں کبھی کاربند
نہ ہوئے کلکتہ جانے سے پہلے وضع کر لئے تھے تو پھر سوال یہ اُٹھتا ہے کہ انہوں نے فارسی
خطوط میں اس اصول کا اتباع کیوں نہیں کیا۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ غالبؔ کی اُردو خطوط
نویسی کا آغاز ۱۸۴۸ء کے قریب ہوتا ہے اور وہ یہ خطوط جدید طرز میں لکھتے ہیں تو ہمارے
اس قیاس کو اور بھی تقویت ہوتی ہے کہ غالبؔ نے خطوط نویسی کے نئے اصول کلکتہ سے
واپسی پر ہی مرتب کئے اور اردو میں اسی اصول کے مطابق خط لکھے گئے۔ البتہ فارسی میں
انہوں نے اپنی پرانی روش نہ بدلی۔ غالباً پنج آہنگ اوّل کی تمہید بھی ۱۸۴۸ء یا ۱۸۴۹ء
ہی میں لکھی گئی تھی۔

اصول مکتوب اس کی بحث سے قطع نظر یہ حقیقت ہے کہ غالبؔ
۱۸۴۸ء۔ ۱۸۴۹ء کے بعد خط وکتابت اکثر و بیشتر اردو ہی میں کرتے تھے۔ البتہ اگر کسی نے
فارسی خط کی فرمائش کی تو پھر اسے فارسی ہی میں جواب لکھ دیتے تھے۔ چنانچہ مولانا محمد عباس
بھوپالی کو لکھتے ہیں۔

"بہت دنوں سے فارسی نثر چھوڑ رکھی ہے اور اردو میں بے تکلف خط و کتابت کا انداز اختیار کر لیا ہے۔ اب آپ نے فرمائش کی ہے کہ آپ کے نام فارسی میں خط لکھوں سو تعمیل ارشاد کر رہا ہوں۔ جنبشِ قلم کا نتیجہ یہ چند لفظ ہیں جو صرف پڑھے جا سکتے ہیں۔ کسی تعریف کے قابل نہیں (پنج آہنگ)

اسی بات کو منشی نولکشور کے خط میں ۱۰ جولائی ۱۸۶۲ء کو یوں لکھتے ہیں۔

"میں نے فارسی میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن اب مجھ سے یہ مشقت نہیں ہوتی۔ میں نے آسان راستہ اختیار کر لیا ہے۔ جو بھی لکھنا ہو اردو میں لکھ لیتا ہوں۔ نہ سخن آرائی نہ خودنمائی۔ تحریر کو گفتگو بنا لیا ہے۔ بہرحال آپ کے ارشاد کی تعمیل پر یہ خط فارسی میں لکھ رہا ہوں۔"

مکتوبات کی ترتیب و تدوین کا جدید طریقہ یہ ہے کہ ہر مکتوب الیہ کے نام کے سب خط یکے بعد دیگرے سن وار درج کئے جائیں یا مکتوب الیہم سے قطع نظر تمام خطوط سن وار مرتب کئے جائیں۔ مگر غالبؔ کے زمانے میں لوگ ان طریقوں سے واقف نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پنج آہنگ کے نولکشوری اڈیشن کے خطوط بھی کسی اصول کے مطابق مرتب نہیں ہوئے ہیں مثلاً نواب مصطفےٰ خان شیفتہؔ کے نام کے خطوط پوری کتاب میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ یہی حال نواب حسام الدین حیدر اور دوسرے کئی اشخاص کے نام خطوں کا ہے۔ ابتدائی خطوط سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید خطوں کو سن وار مرتب کیا گیا ہے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی محمد خلیل الدین اور منشی محمد حسن کے نام کے خطوط جو داخلی شہادت کے مطابق ۱۸۲۵ء اور ۱۸۲۶ء کے ہیں (کتاب کے وسط میں درج ہیں اور ان کے آگے پیچھے ۱۸۴۱ء کے خطوط بہ نام جان جیکب موجود ہیں تو یہ

گمان بھی بے بنیاد ثابت ہوتا ہے۔

غالب اپنی فارسی شاعری پر تو ناز کرتے ہی تھے لیکن وہ اپنی فارسی نثر کو بھی انشاء پردازی کا اعلیٰ نمونہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ نواب علی بہادر کے نام ایک خط میں پنج آہنگ کی ستائش بڑے دل کش انداز میں کی ہے۔ پہلے نواب صاحب کے "لطف طبع، وحدت ذہن، سلامت فکر اور حسن بیان" کو سراہا ہے۔ یعنی اپنے اصول تنقید اور معیار فن کا اظہار کیا ہے، پھر ریختہ گویوں میں "میر تقی میر اور مرزا محمد رفیع سودا اور فارسی گویوں میں صائب، عرفی، نظیری اور شیخ علی حزیں کے مطالعے پر زور دیا ہے مگر اس طرح کہ "جوہر لفظ کو پہچانا جائے اور فروغ معنی پر غور کیا جائے اور خوب و ناخوب میں تمیز کی جائے۔" اور پھر لکھا ہے کہ۔

"پنج آہنگ اگر میری تصنیف نہ ہوتی تو کہتا کہ یہ کتاب فارسی کے لئے خرد مند قانون کا حکم رکھتی ہے اور دقیق و نازک نکات، نادر ترکیبوں اور فصیح و شیریں لفظوں کا قیمتی ذخیرہ ہے۔ ع۔

راست می گویم و امید کہ باور کردند"

اس میں کلام نہیں کہ اُردو خطوط کی مانند پنج آہنگ کے خطوط بھی غالب کی فطری ذہانت اور نکتہ رسی، معنی آفرینی اور راست گفتاری اور شوخی و ظرافت کا دل آویز مرقع ہیں لیکن ان میں عموماً وہ سادگی، روانی بے تکلفی اور بے ساختگی مفقود ہے جو اردو خطوں کی جان ہے۔ بیشتر فارسی خطوں میں تو اسی عبارت آرائی اور رنگ کاری "اغلاق و اغراق، القاب و آداب اور خیریت گوئی اور عافیت جوئی" کی افراط ہے جس کو غالب نے تمہید میں "حشو زاید" سے تعبیر کیا تھا۔ البتہ جو فارسی خطوط میر مہدی مجروح

مرزا ہرگوپال تفتہ اور مولوی سراج الدین احمد جیسے بے تکلف دوستوں اور شاگردوں کے نام ہیں۔ ان کے انداز بیان میں اردو مکتوب کا حسن جھلکتا ہے۔

غالب کے فارسی خطوط اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان سے مصنف کے حالات زندگی کی ترتیب اور اس کے مزاج اور مذاق سخن کی تفہیم میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ۱۸۴۸ء-۱۸۴۹ء کے بعد کے حالات تو غالب کے اردو خطوط میں بھی تفصیل سے درج ہیں۔ لیکن سفر کلکتہ سے شاہی قلعے کی ملازمت تک کے ۲۴، ۲۵ برس کے حالات کے لئے فارسی خطوط نہایت مفید ماخذ ہیں۔ مولانا مہر نے تو غالب کے سفر کلکتہ کی پوری تفصیلات انہیں خطوں سے مرتب کی ہیں۔ نواب لوہارو کی سرد مہری، پنشن کے لئے کلکتہ کا عزم سفر، لکھنؤ میں نواب اودھ کے دربار سے انعام و اکرام کی بے سود کوشش، باندہ میں علالت، پھر الہ آباد کے راستے سے بنارس میں ورود، بنارس کی ثنا و صفت اور پھر کلکتہ کا قیام اور پنشن کے لئے دوڑ دھوپ، غرضیکہ اس دور کی ساری باتیں ان خطوں میں موجود ہیں۔ کلکتہ کے جدید معاشرتی ماحول سے تو غالب اس درجہ متاثر تھے کہ لکھتے ہیں کہ اس شہر کے دہنوروں کے پاس چارۂ مرگ کے سوا سب کا مداوا موجود ہے اور قسمت کے علاوہ بازار میں ہر شئے کی فراوانی ہے۔ اس دیار کی خاک تشبیں دوسری جگہوں کی بادشاہت سے بھی خوش تر ہے۔" کلکتہ انہیں اتنا پسند تھا کہ لکھتے ہیں کہ "اگر اہل و عیال نہ ہوتے اور ان کا طوق گردن میں نہ پڑا ہوتا تو ہر چیز سے دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے آپ کو اس بقعہ میں پہونچا دیتا اور ساری زندگی اسی مینو کدہ میں بسر کر دیتا۔" غالب کی خرد مندی اور جدت پسندی کا سوتا مغربی تہذیب کے اسی مرکز سے ملتا ہے۔

ان خطوط میں غالب نے زندگی کے بعض چھوٹے چھوٹے واقعات بھی

برسبیل تذکرہ لکھ دیے ہیں۔ مثلاً انوار الدولہ بہادر کے نام ۱۸۵۳ یا ۱۸۵۴ء کا ایک خط ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ غالبؔ کو قلعہ کی ملازمت کے زمانے میں ہر صبح آستانہ شاہی پر حاضری دینی پڑتی تھی۔ بہادر شاہ ظفرؔ کبھی ملاقات کرتے تھے اور کبھی نہیں۔ دوسرے یہ کہ غالبؔ نے اپنا ذاتی مکان (جو شاید سسرال سے ملا تھا) تیس سال پیشتر یعنی ۱۸۲۴ء-۲۵ء میں فروخت کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کرائے کے مکانوں ہی میں رہے۔

غالبؔ نے فارسی خطوط میں جا بجا بڑے ادبی نکات بھی بیان کیے ہیں۔ مثلاً منشی رحمت اللہ خان نے واسوخت کی فرمائش کی ہے۔ اُن کو لکھتے ہیں کہ "فارسی خصوصاً نثر میں واسوخت نام کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ میں نے پہلوی زبان کے کسی پہلوان سخن کو اس روش میں زور آزمائی کرتے نہیں دیکھا۔ البتہ خراسان کے شاعر ملا وحشیؔ کے کلام میں ایک نظم مسدس ملتی ہے جسے لوگ واسوخت کہتے ہیں"۔

گل محمد خاں ناطقؔ مکرانی نے غالبؔ کی کسی مثنوی کے ایک لفظ پر اعتراض کیا تھا اور لکھا تھا کہ سؤر کے پنجے نہیں کھر ہوتے ہیں۔ اس کے جواب میں اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں لیکن شوخی و ظرافت کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

"اگرچہ میں نے اس کو جانور خرابوں اور ویرانوں میں دیکھا ہے لیکن اس کے پاؤں پر کبھی غور نہیں کیا۔ میرا گمان تھا کہ اس کے پاؤں بھی کتے بلی کے پاؤں جیسے ہوتے ہوں گے۔ اب آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ سؤر کے سُم ہوتے ہیں پنجے نہیں۔ اگر کلیات چھپنے سے پہلے آپ کا خط مل جاتا تو میں اس مصرع کو بدل کر "پنجہ زدن ساز کرد" کے بجائے "بدنفسی ساز کرد" لکھ دیتا۔ بہر حال اس چوک پر مجھے ملال نہیں کیونکہ یہ

سہوِ سخن ور کے طرزِ سخن سے ناآشنا ہونے کی دلیل نہیں بلکہ سوَر کے پاؤں کی ساخت سے لاعلمی کے سبب ہے۔ اس سے نفسِ مضمون میں کوئی فرق نہیں آتا۔"

ایک صاحب نے قصیدے کی فرمائش کی ہے۔ جواب میں لکھتے ہیں کہ "اگر یہ کام نقاشی اور گلدستہ بندی کی طرح صرف دست و بازو کی مدد سے انجام پاسکتا تو میں اپنے دلی خستگی کو بھول کر تعمیل ارشاد کی عزت حاصل کرتا لیکن کیا کروں کہ شعر گوئی کا تعلق دل سے ہے۔ جب دل ہی ٹھکانے نہ ہو تو زبانِ سخن کہاں سے ہلے؟ آپ جیسے دیدہ ور صاحبِ دل سے بڑھ کر اس حقیقت کا شناسا اور کون ہو گا کہ شعر کہنے کے لئے دل کا یکسو ہونا ضروری ہے۔ یقین کیجئے کہ یہ دلِ صد پارہ جو میرے سینے میں ہے میرا دشمن دیرینہ بن گیا ہے اور اب سخن گستری اور معنی آفرینی کا اہل نہیں رہا۔" آئنہ کو چمکا کر صورتِ معنی کو اجاگر کرنے والا مشہور فقرہ بھی ایک خط ہی کا ہے۔

غالبؔ نے دہلی کے مشاعروں خصوصاً شاہی مشاعروں کا حال بھی بڑے دلچسپ پیرائے میں تحریر کیا ہے۔ میر مہدی مجروحؔ کو ایک شاہی مشاعرہ کی داستان سناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "مرزا حاجی شہرتؔ نے کم و بیش ستر شعر کی غزل پڑھی۔ میں اُکتا کر پیشاب کے بہانے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس وقت تک شہر کی دکانیں کھلی تھیں۔ چراغ روشن تھے۔ ابھی آدھی رات نہیں گذری تھی۔ میں گھر آکر دیر تک اپنی اُکتاہٹ شراب میں ڈبوتا رہا۔"

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ۱۸۵۰ء کے بعد غالبؔ خط و کتابت تو زیادہ تر اُردو میں کرتے تھے لیکن شعر زیادہ تر فارسی میں کہتے تھے۔ چنانچہ نواب سعد الدین

شفیق کو لکھتے ہیں کہ۔

"ہر چند ایک مدت سے طبیعت اُردو شعر کہنے پر مائل نہیں لیکن کبھی کبھی بادشاہ کی رضا جوئی کی خاطر یا ملکہ عالیہ کے فرمان کی تعمیل میں اردو میں بھی شعر کہنے پڑتے ہیں"۔

نواب علی بہادر مسند نشین باندہ کو بھی اسی مضمون کا خط لکھا ہے"اردو میں شعر بہت کم کہتا ہوں۔ مدت سے طبیعت فارسی گوئی کی طرف مائل ہے۔ لیکن حضرت ظل الٰہی کی رضائے خاطر کے لئے اردو بھی کہہ لیتا ہوں"۔

غالب کے فارسی خطوط پر ارباب نظر نے ابھی تک بہت کم توجہ کی ہے۔ حالانکہ ان میں تحقیق کی ہنوز بڑی گنجائش ہے۔ غالب کے شیدائیوں کو چاہیئے کہ پنج آہنگ، متفرقات غالب اور غالب کے دیگر فارسی خطوط کو یکجا کریں اور باعتبار سنین مرتب کریں۔ یہ کام زیادہ دشوار نہیں کیونکہ بعض خطوں پر سن اور تاریخیں درج ہیں اور اکثر و بیشتر کے متن اور اندرونی شہادتوں سے کم از کم یہ اندازہ تو لگایا ہی جا سکتا ہے کہ وہ کس دَور کے ہیں۔

جناب عمر مہاجر صاحب لائق صد تحسین و تبریک ہیں کہ انہوں نے غالب کے ۱۶۰ فارسی خطوں کو اُردو میں منتقل کیا ہے۔ غالب کی فارسی نثر کا ترجمہ کرنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنج آہنگ کی اشاعت کو سو سال سے زیادہ مدت گذر چکی ہے لیکن کسی غالب شناس کو اب تک اس کے ترجمے کی جرأت نہیں ہوئی۔ مشکل کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ہمارے ارباب قلم اپنی اُردو تحریروں میں غالب کے فارسی خطوں کے اقتباس دینے میں تو بخل نہیں

کرتے لیکن ان کا ترجمہ کرنے سے گریز کر جاتے ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ عمر مہاجر صاحب کا ترجمہ حرفِ آخر ہے یا یہ کہ انہوں نے فارسی عبارت کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا ہے کیونکہ یہ قریب محال تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ محمد عمر مہاجر صاحب نے یہ دشوار کام بڑے خلوص اور کاوش و محنت سے سر انجام دیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ انہوں نے غالبؔ کے اسلوبِ بیان کی دلکشی میں مطلق فرق نہیں آنے دیا ہے چنانچہ پنج آہنگ کے ترجمے کو اردوئے معلّیٰ کے خطوں میں شامل کر دیا جائے تو اصل اور ترجمے میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اور یہ عمر مہاجر صاحب کا بہت بڑا ادبی کمال ہے۔

ہمیں امید ہے کہ عمر مہاجر صاحب غالبؔ کے بقیہ فارسی خطوں کو بھی اُردو میں منتقل کرنے سے دریغ نہ کریں گے اور اس کتاب کے دوسرے اڈیشن کو زیادہ جامع اور مبسوط بنانے میں ادارۂ یادگارِ غالب کی اعانت فرمائیں گے۔

سبطِ حسن

خطوط کی فہرست

خط نمبر	مکتوب الیہ	صفحہ	خط نمبر	مکتوب الیہ	صفحہ
۱	سید علی اکبر خاں	۱	۱۶	حکیم احسن اللہ خاں	۱۷
۲	علی بخش خاں	۲	۱۷	الف بیگ	۱۸
۳	علی بخش خاں	۳	۱۸	سبحان علی خاں	۱۹
۴	علی بخش خاں	۳	۱۹	سبحان علی خاں	۲۰
۵	علی بخش خاں	۵	۲۰	امام بخش ناسخ	۲۰
۶	صدر الدین خاں آزردہ	۶	۲۱	مولوی نور الحسن	۲۲
۷	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۶	۲۲	حافظ محمد فضل حق	۲۴
۸	میر اعظم علی	۸	۲۳	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۲۵
۹	کرم حسین خاں	۱۰	۲۴	سراج الدین احمد	۲۶
۱۰	سبحان علی خاں	۱۱	۲۵	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۲۷
۱۱	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۱۲	۲۶	ولایت حسین خاں	۲۸
۱۲	علی اکبر خاں	۱۳	۲۷	صدر الدین خاں آزردہ	۳۰
۱۳	شیخ امام بخش ناسخ	۱۴	۲۸	شیخ امیر اللہ سرور	۳۰
۱۴	مرزا سلیمان شکوہ	۱۵	۲۵	مومن خاں مومن	۳۲
۱۵	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۱۶	۳۰	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۳۳

خط نمبر	مکتوب الیہ	صفحہ	خط نمبر	مکتوب الیہ	صفحہ
۳۱	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۳۴	۴۹	سراج الدین احمد	۵۲
۳۲	مولوی سید ولایت حسین	۳۵	۵۰	سراج الدین احمد	۵۳
۳۳	سراج الدین احمد	۳۶	۵۱	سراج الدین احمد	۵[illegible]
۳۴	سراج الدین احمد	۳۷	۵۲	سراج الدین احمد	۵۵
۳۵	سراج الدین احمد	۳۷	۵۳	سراج الدین احمد	۵۷
۳۶	سراج الدین احمد	۳۹	۵۴	سراج الدین احمد	۵۸
۳۷	سراج الدین احمد	۴۰	۵۵	سراج الدین احمد	۵۹
۳۸	سراج الدین احمد	۴۱	۵۶	سراج الدین احمد	۶۰
۳۹	سراج الدین احمد	۴۲	۵۷	سراج الدین احمد	۶۱
۴۰	سراج الدین احمد	۴۳	۵۸	سراج الدین احمد	۶۲
۴۱	سراج الدین احمد	۴۴	۵۹	سراج الدین احمد	۶۳
۴۲	سراج الدین احمد	۴۵	۶۰	سراج الدین احمد	۶۵
۴۳	سراج الدین احمد	۴۶	۶۱	رائے چھجمل کھتری	۶۹
۴۴	سراج الدین احمد	۴۷	۶۲	رائے چھجمل کھتری	۷۰
۴۵	سراج الدین احمد	۴۸	۶۳	رائے چھجمل کھتری	۷۱
۴۶	سراج الدین احمد	۴۹	۶۴	رائے چھجمل کھتری	۷۲
۴۷	سراج الدین احمد	۵۰	۶۵	رائے چھجمل کھتری	۷۳
۴۸	سراج الدین احمد	۵۱	۶۶	رائے چھجمل کھتری	۷۴

خط نمبر	مکتوب الیہ	صفحہ
۶۷	شیخ امام بخش ناسخ	۷۶
۶۸	شیخ امام بخش ناسخ	۷۹
۶۹	محمد علی خاں	۸۰
۷۰	محمد علی خاں	۸۰
۷۱	محمد علی خاں	۸۲
۷۲	محمد علی خاں	۸۳
۷۳	محمد علی خاں	۸۴
۷۴	محمد علی خاں	۸۵
۷۵	محمد علی خاں	۸۶
۷۶	محمد علی خاں	۸۸
۷۷	میجر جان جیکب	۸۹
۷۸	میجر جان جیکب	۹۰
۷۹	میجر جان جیکب	۹۱
۸۰	میجر جان جیکب	۹۲
۸۱	میجر جان جیکب	۹۳
۸۲	منشی محمد حسن	۹۴
۸۳	منشی محمد حسن	۹۵
۸۴	نوروز علی خاں	۹۵
۸۵	نوروز علی خاں	۹۷
۸۶	مصطفےٰ خاں شیفتہ	۹۸
۸۷	آغا علی خاں	۹۹
۸۸	میر سید علی غمگین	۱۰۰
۸۹	مولوی ولایت حسین	۱۰۲
۹۰	حسام الدین حیدر خاں	۱۰۳
۹۱	حسام الدین حیدر خاں	۱۰۴
۹۲	حسین مرزا	۱۰۴
۹۳	التفات حسین خاں	۱۰۵
۹۴	میاں محمد نجف	۱۰۶
۹۵	ضیاء الدین احمد خاں نیر	۱۰۷
۹۶	جیمس تامسن	۱۰۸
۹۷	جیمس تامسن	۱۰۹
۹۸	ضیاء الدین احمد خاں نیر	۱۱۰
۹۹	شمس الامراء	۱۱۱
۱۰۰	منشی فضل اللہ خاں	۱۱۳
۱۰۱	مولوی فضل حق	۱۱۴
۱۰۲	مظفر حسین خاں	۱۱۵

خط نمبر	مکتوب الیہ	صفحہ	خط نمبر	مکتوب الیہ	صفحہ
۱۰۳	محمد خلیل الدین خاں	۱۱۷	۱۲۱	میر احمد حسین میکش	۱۴۲
۱۰۴	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۱۱۹	۱۲۲	شیخ بخش الدین مارہری	۱۴۳
۱۰۵	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۱۲۰	۱۲۳	نواب عبداللہ خاں	۱۴۴
۱۰۶	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۱۲۱	۱۲۴	مرزا اسفندیار بیگ	۱۴۵
۱۰۷	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۱۲۲	۱۲۵	محمد علی خاں	۱۴۶
۱۰۸	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۱۲۳	۱۲۶	رحمت اللہ خاں	۱۴۸
۱۰۹	جیمس تامسن	۱۲۵	۱۲۷	سعد الدین خاں شفق	۱۴۹
۱۱۰	مظفر حسین خاں	۱۲۷	۱۲۸	رجب علی خاں	۱۵۱
۱۱۱	امیر حسن خاں	۱۲۸	۱۲۹	عابد علی خاں	۱۵۲
۱۱۲	امیر حسن خاں	۱۳۰	۱۳۰	قاضی عبدالجمیل بریلوی	۱۵۳
۱۱۳	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۱۳۱	۱۳۱	مولوی سید محمد	۱۵۴
۱۱۴	حشمت جنگ	۱۳۲	۱۳۲	خواجہ ظہیر الدین خاں	۱۵۵
۱۱۵	مولوی سید محمد	۱۳۳	۱۳۳	سعد الدین خاں شفق	۱۵۶
۱۱۶	منشی فضل اللہ از جانب حکیم احسن اللہ خاں	۱۳۴	۱۳۴	نواب علی بہادر خاں	۱۵۷
۱۱۷	امداد حسین خاں	۱۳۶	۱۳۵	سعد الدین خاں شفق	۱۵۹
۱۱۸	محمد سعد الدین خاں شفق	۱۳۷	۱۳۶	روح اللہ خاں	۱۶۱
۱۱۹	ہرگوپال تفتہ	۱۳۸	۱۳۷	میر واجد علی خاں بلگرامی	۱۶۲
۱۲۰	منشی نبی بخش حقیر	۱۴۰	۱۳۸	رجب علی خاں	۱۶۳

خط نمبر	مکتوب الیہ	صفحہ	خط نمبر	مکتوب الیہ	صفحہ
۱۳۹	میر مہدی	۱۶۴	۱۵۰	منشی حبیب اللہ	۱۷۷
۱۴۰	میر مہدی	۱۶۵	۱۵۱	نواب مختار الملک	۱۷۹
۱۴۱	حسام الدین حیدر خاں	۱۶۷	۱۵۲	سلطان محمد بہادر	۱۸۰
۱۴۲	حسام الدین حیدر خاں	۱۶۸	۱۵۳	جواہر سنگھ جوہر	۱۸۰
۱۴۳	حسام الدین حیدر خاں	۱۶۹	۱۵۴	جواہر سنگھ جوہر	۱۸۲
۱۴۴	حسام الدین حیدر خاں	۱۷۰	۱۵۵	جواہر سنگھ جوہر	۱۸۳
۱۴۵	حسام الدین حیدر خاں	۱۷۱	۱۵۶	دو پنجابی دوستوں کے نام	۱۸۳
۱۴۶	مولوی عبدالوہاب لکھنوی	۱۷۱	۱۵۷	آغا حسین ناخدائے شیرازی	۱۸۴
۱۴۷	بشیر الدین میسوری	۱۷۳	۱۵۸	میر غلام بابا خاں	۱۸۵
۱۴۸	گل محمد خاں ناطق مکرانی	۱۷۴	۱۵۹	منشی نولکشور	۱۸۶
۱۴۹	محمد عباس بھوپالی	۱۷۶	۱۶۰	خاتمہ پنج آہنگ	۱۸۸

	نام مکتوب الیہ	خط نمبر	صفحہ		نام مکتوب الیہ	خط نمبر	صفحہ
۱	سید علی اکبر خاں	۱	۱		مصطفٰے خاں شیفتہ	۱۰۶	۱۲۱
	سید علی اکبر خاں	۱۳	۱۳		مصطفٰے خاں شیفتہ	۱۰۷	۱۲۲
۲	علی بخش خاں	۲	۲		مصطفٰے خاں شیفتہ	۱۰۸	۱۲۳
	علی بخش خاں	۳	۳		مصطفٰے خاں شیفتہ	۱۱۳	۱۳۱
	علی بخش خاں	۴	۳	۵	میر اعظم علی	۸	۸
	علی بخش خاں	۵	۵	۶	کرم حسین خاں	۹	۱۰
۳	صدر الدین خاں آزردہ	۶	۶	۷	سبحان علی خاں	۱۰	۱۱

	نام مکتوب الیہ	خط نمبر	صفحہ
	صدر الدین خاں آزردہ	۲۷	۳۰
۴	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۷	۶
	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۱۱	۱۲
	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۱۵	۱۶
	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۲۳	۲۵
	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۲۵	۲۷
	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۳۰	۳۳
	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۳۱	۳۴
	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۸۶	۹۸
	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۱۰۴	۱۱۹
	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۱۰۵	۱۲۰
	حافظ محمد فضل حق	۱۰۱	۱۱۴
۱۴	سراج الدین احمد	۲۴	۲۶
	سراج الدین احمد ۳۳ سے ۴۰ تک، ۳۶ سے ۵۰ تک		
۱۵	ولایت حسین خاں	۲۶	۲۸
	ولایت حسین خاں	۳۲	۳۵
	ولایت حسین خاں	۸۹	۱۰۲
۱۶	شیخ امیر اللہ سرور	۲۸	۳۰
۱۷	مومن خاں مومن	۲۹	۳۲
۱۸	رائے چھجمل کھتری، ۶۱ سے ۶۶ تک، ۶۹ سے ۷۴ تک		
۱۹	محمد علی خاں ۶۹ سے ۷۶ تک، ۸۰ سے ۸۸ تک		
	محمد علی خاں	۱۲۵	۱۴۶

	نام مکتوب الیہ	خط نمبر	صفحہ
	سبحان علی خاں	۱۸	۱۹
	سبحان علی خاں	۱۹	۲۰
۸	شیخ امام بخش ناسخ	۱۳	۱۴
	شیخ امام بخش ناسخ	۲۰	۲۰
	شیخ امام بخش ناسخ	۶۷	۷۶
	شیخ امام بخش ناسخ	۶۸	۷۹
۹	مرزا سلیمان شکوہ	۱۴	۱۵
۱۰	حکیم احسن اللہ خاں	۱۶	۱۷
۱۱	الف بیگ	۱۷	۱۸
۱۲	مولوی نور الحسن	۲۱	۲۲
۱۳	حافظ محمد فضل حق	۲۴	۲۴
	حسام الدین حیدر خاں، ۱۰۱ سے ۵۴ تک، ۱۰۸، ۱۰۱ سے تک		
۲۶	حسین مرزا	۹۲	۹۴
۲۷	التفات حسین خاں	۹۳	۱۰۵
۲۸	میاں محمد نجف	۹۴	۱۰۶
۲۹	ضیاء الدین احمد خاں نیر	۹۵	۱۰۷
	ضیاء الدین احمد خاں نیر	۹۷	۱۱۰
۳۰	جیمس تامسن	۹۶	۱۰۸
	جیمس تامسن	۹۷	۱۰۹
	جیمس تامسن	۱۰۹	۱۲۵
۳۱	شمس الامرا	۹۹	۱۱۱
۳۲	منشی فضل اللہ خاں	۱۰۰	۱۱۳

نمبر	نام مکتوب الیہ	خط نمبر	صفحہ	نمبر	نام مکتوب الیہ	خط نمبر	صفحہ
٢٠	مجروح جانِ جیب۔ ٧٧ سے ٨١ تک۔ ٨٩ سے ٩٣ تک				منشی فضل اللہ خاں	١١٩	١٣٤
٢١	منشی محمد حسن	٨٢	٩٤	٣٣	مظفر حسین خاں	١٠٢	١١٥
	منشی محمد حسن	٨٣	٩٥		مظفر حسین خاں	١١٠	١٢٧
٢٢	نوروز علی خاں	٨٤	٩٥	٣٤	امیر حسن خاں	١١١	١١٨
	نوروز علی خاں	٨٥	٩٧		امیر حسن خاں	١١٢	١٣٠
٢٣	آغا علی خاں	٨٧	٩٩	٣٥	محمد خلیل الدین خاں	١٠٣	١١٧
٢٤	میر سید علی غمگین	٨٨	١٠٠	٣٦	حشمت جنگ	١١٤	١٣٢
٢٥	حسام الدین حیدر خاں	٩٠	١٠٣	٣٧	مولوی سید محمد	١١٥	١٣٣
	حسام الدین حیدر خاں	٩١	١٠٤		مولوی سید محمد	١٣١	١٥٤
٣٨	امداد حسین	١١٧	١٣٦	٥١	نواب علی بہادر خاں	١٣٤	١٥٧
٣٩	محمد سعد الدین خاں شفق	١١٨	١٣٧	٥٢	روح اللہ خاں	١٣٥	١٦١
	محمد سعد الدین خاں شفق	١٢٨	١٤٩	٥٣	میر واجد علی بلگرامی	١٣٧	١٦٢
	محمد سعد الدین خاں شفق	١٣٣	١٥٠	٥٤	میر مہدی	١٣٩	١٦٤
	محمد سعد الدین خاں شفق	١٣٥	١٥٩		میر مہدی	١٤٠	١٦٥
٤٠	منشی ہرگوپال تفتہ	١١٩	١٣٨	٥٥	مولوی عبدالوہاب لکھنوی	١٤٦	١٧١
٤١	منشی نبی بخش حقیر	١٢٠	١٤٠	٥٦	بشیر الدین بلیسوری	١٤٧	١٧٣
٤٢	میر احمد حسین میکش	١٢١	١٤٢	٥٧	گل محمد خاں ناطق مکرانی	١٤٨	١٧٤
٤٣	شیخ بخش الدین مارہروی	١٢٢	١٤٣	٥٨	محمد عباس بھوپالی	١٤٩	١٧٦
٤٤	نواب عبداللہ خاں	١٢٣	١٤٠	٥٩	منشی حبیب اللہ ذکا	١٥٠	١٧٧
٤٥	مرزا اسفندیار بیگ	١٢٤	١٤٥	٦٠	نواب مختار الملک	١٥١	١٧٩
٤٦	رحمت اللہ خاں	١٢٦	١٤٨	٦١	سلطان محمد بہادر	١٥٢	١٨٠
٤٧	رجب علی خاں	١٢٧	١٥١	٦٢	جواہر سنگھ جوہر ١٥٣ سے ١٥٥ تک۔ ١٨٠ سے ١٨٢ تک		
	رجب علی خاں	١٢٨	١٥١	٦٣	دو پنجابی دوستوں کے نام	١٥٦	١٨٣
٤٨	عابد علی خاں	١٢٩	١٥٢	٦٤	آغا حسین ناخدائے شیرازی	١٥٧	١٨٤
٤٩	قاضی عبدالجمیل بریلوی	١٣٠	١٥٣	٦٥	میر غلام بابا خاں	١٥٨	١٨٥
٥٠	خواجہ ظہیر الدین خاں	١٣٢	١٥٥	٦٦	منشی نولکشور	١٥٩	١٨٦

معذرت: صفحہ ۱۴ پر خط نمبر ۳۸ کی جگہ خط ۳۹ چھپ گیا ہے۔ خط ۳۹ کو ۳۸ پڑھا جائے۔

خط (۱)

نواب سیّد علی اکبر خاں متولی امام باڑہ ہوگلی بندر کے نام

قبلۂ خدا پرستاں سلامت!

جب ممدوح تعریف سے بے نیاز اور مدح کرنے والے کی زبان ستائش سے عاجز ہو تو عرضِ نیاز کی کوشش فضول اور شرحِ شوق کو طول دینا بے کار ہے۔ سوچتا ہوں کیا لکھوں کہ خاموشی کا بھرم رہ جائے اور کوتاہ قلمی کا داغ مٹ جائے۔ بہر حال یہ نیاز نامہ ایک طرح کا سلام روستائی اور اس کا ایک ایک حرف کاسۂ گدائی ہے۔ پیٹ کا بندہ ہوں اور قدرے ناتواں۔ مگر کم بخت دل ہے کہ دسترخوان کی رونق اور آرائشِ جاں دونوں کا خواہش مند ہے۔ ظاہر ہے کہ اس خواہش کی تکمیل آم ہی سے ہو سکتی ہے۔ کلکتہ والوں کا کہنا ہے کہ ہوگلی آموں کی نگری ہے۔ شوق کا تقاضا ہے کہ فصل کے ختم ہونے تک ہوگلی سے آم اور جناب کے گلشنِ ایثار سے پھول آتے رہیں اور میری طرف سے سپاس گزاری ہوتی رہے۔ لیکن حرص کہتی ہے کہ یہ بھی کم ہے۔

گلویم تشنۂ جان و دلم افسردہ ہے ساقی
بدہ نوشینہ داروئی کہ ہم آتش ہم آبستی

الٰہی نخلِ مراد ہمیشہ سرسبز و شاداب اور غالب ہوا خواہ کے سر پر سایہ گستر رہے۔

خط (۲)

دہلی سے ۔ مرزا علی بخش خاں بہادر کے نام

کار برادر بہ برادر نکوست   بہ زبرادر نہ تواں یافت دوست

اپنی تکلیفوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا اور سننے والے کو پریشان کرنا میری عادت نہیں ۔ لیکن آپ کہ میرے بھائی بھی ہیں اور دوست بھی ۔ آپ سے اپنا حال نہ کہوں تو اور کس سے کہوں گا نواب صاحب پر تکیہ کیا تھا ۔ کیا بتاؤں کہ کیا گذری ۔ بس یوں سمجھئے کہ میری کیفیت اُس مجرم کی سی ہے ، جو عذابِ زنداں میں گرفتار ہو اور منہ سے اُف تک نہ کر سکے ۔ آتشِ انتظار کی حدت سے جھلسا جا رہا ہوں ۔ سوچتا ہوں کہ کیا جہنم میں کافروں پر بھی یہی کچھ گذرتی ہوگی ۔ فیروز پور اس لئے نہیں آیا کہ پھر دہلی آنا پڑتا ۔ اب ذرا نواب صاحب کا حال سنئے ۔ انہوں نے مجھ سے زبانی ہمدردی تو بہت جتائی لیکن حقیقت میں ستم التفات آمیز سے کام لیا ۔ کہاں کا صبر و شکیب اور کیسی شادمانی حال یہ ہے کہ شاہ جہاں آباد کے در و دیوار سے نحوست برس رہی ہے ۔ ایک اندھیر سا اندھیر ہے ۔ ایسے میں روشنی کا گذر کہاں ! اس بارانِ سنگ سے اپنے دل کو جو شیشہ کی طرح نازک ہے ۔ کیوں کر بچاؤں !

میرا مام علی کے ہاتھ نواب کے نام عرض داشت بھیج رہا ہوں ۔ آپ اس معاملہ میں غفلت اور نواب سے مروت ہرگز نہ کیجئے ۔ جب میری عرضداشت پیش ہو تو آپ وہاں ضرور موجود رہیئے تاکہ تحریر کو گذارش سے تقویت

پہنچے اور میر امام علی کو بھی عرض حال کی ہمت ہو۔ بعض احباب کا خیال ہے کہ اپنا حال زار میں خود نواب پر ظاہر نہیں کرتا۔ ممکن یہ ہو سکتا ہے کہ نواب کو میری تکلیفوں کی خبر ہو اور وہ مداوا نہ کریں۔ سو میں یہ چاہتا ہوں کہ میری عرض داشت قبول ہو یا نہ ہو کم از کم ان ادا ناشناس کہنے والوں کا منہ تو بند ہو جائے۔ خدا کے لئے کوئی ایسی تدبیر کیجئے کہ میر امام علی جلد میرے پاس لوٹ آئیں۔ میں اپنے دوستان ناصح کو خیرباد کہوں اور بے فکری سے مشرق کی طرف چل پڑوں۔ والسلام۔

خط (۳)

برادر مہربان! گرامی تر از جان سلامت! مداری خاں آپ کی خدمت میں خط کے ساتھ حاضر ہو رہا ہے۔ میرا مال و اسباب جو کچھ وہاں ہو اس کے حوالے کر دیجئے اور منا حقہ بردار کی تحویل میں جو سامان ہے وہ اُس سے لے کر مداری خاں کو دے دیجئے۔ سنا جا رہا ہے کہ نواب دہلی آ رہے ہیں۔ یہ کہاں تک سچ ہے لکھ بھیجئے اور یہ بھی بتائیے کہ کیا آپ بھی نواب کے ہمراہ ہوں گے۔ اگر یہ خبر غلط ہو تو میں خود فیروز پور آتا ہوں تاکہ عم عالی مقدار کی قدم بوسی کا شرف اور آپ سے ملاقات کی مسرت حاصل کروں۔ خدا آپ کی عمر و دولت میں ترقی دے۔

خط (۴)

کلکتہ سے۔

برادر محترم و نیک اختر کے نام کہ جس کی چشم دل اس قدر دوری اور

فاصلے کے باوجود میری طرف نگراں ہے۔ بارے غالب رُہرو کی بادیہ نوردی ختم ہوئی اور کلکتہ میں اُس کا اسباب سفر کھلا۔ کلکتہ کیا ہے، ایک پوری دُنیا ہے جس میں سوائے علاجِ مرگ کے ہر چیز میّسر ہے۔ اس کے ہنر وروں کے آگے ہر کام سہل ہے۔ اس کے بازاروں میں سوائے جنسِ قسمت کے ہر شئے فراواں ہے۔ میری قیام گاہ شملہ بازار میں ہے جو یہاں پہنچتے ہی کسی زحمتِ جستجو کے بغیر مجھے مل گئی۔ خدائے بزرگ کا شکر کس منہ سے بجالاؤں کہ اس نے حاکموں کے دل میں مجھے جگہ دی۔ محفل میں میری خواہش سے بلند مرتبہ عطا کیا، اور مجھ سے بے کس کو اعیانِ کونسل میں مسٹر اندرو اسٹرلنگ جیسا مربی بخشا جس کا کام دلِ دردمند کا حال سننا اور اس کے زخموں پر مرہم رکھنا ہے۔ ہر چند دل ایک عمر سے مایوسی کا خوگر ہے اور عرصہ ہوا کہ دامنِ امید ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے۔ لیکن کیا عجب کہ اِس مردِ فیاض کی کام بخشی کی تاثیر سے یکبارگی میری مایوسیوں کا خاتمہ ہو جائے۔

میر فضل مولیٰ خاں نامی ایک دوست سے اتفاقاً راستہ میں ملاقات ہوئی اور اُن کی زبانی فخر اللہ ولد بہادر کی رحلت کی خبر ملی۔ اس کی تصدیق کلکتہ میں مرزا افضل بیگ خاں اور دوسرے احباب نے بھی کی۔ افسوس کہ ایک روشن چراغ بجھ گیا اور آرزوؤں کے شبستان کو تیرہ و تار کر گیا۔ آپ کی طرف سے مجھے بڑی تشویش ہے۔ آثار کچھ اچھے نظر نہیں آتے۔ اندیشہ ہے کہ کہیں نااہلوں کی بن آئے اور وہ انجمن ہی درہم برہم ہو جائے۔ ہوشمندی اور احتیاط سے کام کیجئے۔ اس خط کا جواب جلد دیجئے اور وہاں کے حالات تفصیل سے لکھئے۔ عمر دراز اور

بخت ساز گار ہو۔

خط (۵)

کلکتہ سے:

جان برادر۔

مطالب بہت زیادہ اور پیچیدہ ہیں۔ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ کہنا اور تحریر کو تقریر کا آئینہ بنانا چاہتا ہوں۔ غور کیجئے کہ کیا کہہ رہا ہوں، مقصود کیا ہے اور اس سلسلے میں آپ کو کیا کرنا ہے۔ نواب اکبر علی یہاں کے ممتاز اور ذی مرتبہ بزرگوں میں ہیں۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ کونسل کے حکام نے میرا مقدمہ حاکم دہلی کے سپرد کیا ہے، جس کے منشی التفات حسین خاں سے ـــــــــــ ـــــــــــ دیرینہ مراسم ہیں۔ تو منشی صاحب کے نام ایک سفارش نامہ تحریر فرمایا۔ میں نے اُن کا یہ مکتوب اپنے خط کے ساتھ لالہ ہیرا لال وکیل کو بھیج دیا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ خط منشی صاحب کی نظرِ قبول سے گزر چکا ہے اور کارسازی کی سبیل نکل آئی ہے۔ آغاز کارروائی میں کرنل ہنری املاک نے جو انگریزی فوج کے ایک ممتاز افسر ہیں اور صاحب رزیڈنٹ بہادر دہلی سے جن کے برادرانہ تعلقات ہیں میرے حق میں سودمند باتیں لکھی ہیں۔ چنانچہ اس کے اثر سے حاکم کا رویّہ ہمدردانہ ہو گیا ہے اور میرے وکیل پر خاص نظرِ التفات ہے۔ اب مقدمہ کی رپورٹ محکمہ رزیڈنسی دہلی سے روانہ ہونے والی ہے۔ آپ منشی التفات حسین خان سے ملئے اور باتوں باتوں میں کرنل ہنری املاک کی سفارش کا بھی ذکر کر دیجئے۔ اس سے حصولِ مدعا میں

سہولت ہوگی اور حاکم کے ضمیر میں میری گزارشات کا نقش گہرا ہو جائیگا۔ بہرحال آپ خود وہاں موجود ہیں مصلحت کے مطابق ضروری تدبیر سے دریغ نہ کیجئے۔ زیادہ کیا لکھوں سوائے اس کے کہ محبت میں من و تو کی گنجائش نہیں ہوتی۔

والسلام والاکرام

خط (۶)

مولوی محمد صدر الدین خاں بہادر صدر الصدور کے نام

قبلۂ حاجات! آج ظہر کے وقت در دولت پر حاضر ہوا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ زنجیر کھڑکائی۔ ایک صاحب جو میری طرح آپ کے ارادت مندوں میں ہیں باہر آئے اور بتایا کہ دیوان عدل روشن ہے اور جناب سماعت مقدمات میں مصروف ہیں، اور دلِ آرزومند لئے مجبوراً واپس ہونا پڑا۔ میری اس محرومی میں کچھ تو اس مہربان کا ہاتھ تھا اور کچھ میری اپنی قسمت کی برگشتگی کا اثر۔

خط (۷)

نواب مصطفیٰ خاں بہادر کے خط کے جواب میں

ذاتِ حق کے عارفوں کا کیا کہنا جن کی فکرِ عالی ایک جہانِ معنی پر محیط ہے فرماتے ہیں کہ کوئی شئے وجودِ مطلق کے فیض کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہوتی۔ ہر ہستی میں وجودِ مطلق کا جوہرِ تابندہ آشکار ہے جو اسے نیستی کی تیرگی سے دور رکھتا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے تو پھر "ہیچی" اور "ناتمامی" کیا ہے۔ ہیچی یعنی ورقِ سادہ پر ایک دھندلا خاکہ۔ ناتمامی یعنی ظہور کی ایک نیم رخ تصویر۔ اگر فیضِ ہستی عام ہے تو یہ ابہام کیسا اور ناتمامی کیوں۔؟ ذہن دیر تک ان ہی خیالات کی آماجگاہ تھا کہ دفعتاً صبح دمِ فکر کو آگہی کی روشنی ملی اور منکشف ہوا کہ ہیچی ہی اصل [illegible] اور ناتمامی ہی عین کمال ہے۔ یارب میں بھی کیا آدمی ہوں کہ کچھ نہ ہونے پر بھی سب کچھ ہوں۔ ہیچی میں یگانہ، ناتمامی میں کامل، سُبکی میں گراں، خاکستر ہو کر بھی خام۔ قدرت سے دلِ دردمند عطا ہوا تھا اور زبان آشنائے راز ملی تھی۔ عمر بھر خیال کے رہ گزار سے سنگ ریزے چنتا رہا کہ پائے سُخن کو ٹھوکر نہ لگے۔ لیکن اس سے بڑھ کر بعید از حقیقت اور کیا ہو گی کہ جب تک دکان کو جنسِ سخن سے سجائے بیٹھا رہا کوئی خریدار قریب نہ آیا اور اب کہ دکان خالی اور زبان بے مایہ ہو چکی ہے ایک گراں مایہ خریدار اپنی فکرِ روشن کے عیار پر میرے ناقص کلام کو پرکھنا اور موتی کو خزف کے ساتھ تولنا چاہتا ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ اگر میں اس خریدار گرامی مرتبت کے کلام کے ساتھ اپنا کلام رکھ سکتا تو شرمسار نہ ہوتا۔ مگر مری خجلت تو اس شرمساری سے کہیں زیادہ ہے۔

لباسِ فاخرہ پہننے والوں کی انجمن میں پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس انسان تو بار پا سکتا ہے۔ لیکن اس آدمی کی بے آبروئی کا کیا ٹھکانا جس کے پاس تن ڈھانپنے کو ایک دھجی بھی نہ ہو ___ سوائے دکانِ بے رونق کے خریدار! کیا بتاؤں کہ خط پا کر کتنی مسرت ہوئی۔ شیوا بیانوں کی زبان سے اپنی تعریف سننا آسان نہیں لیکن اہلِ نظر کے آگے عرضِ ہنر کرنا اس سے کہیں زیادہ دشوار ہے۔ چالیس

سال کی جگر کاوی کا جو کچھ حاصل تھا وہ بہت پہلے ہی پیش کر چکا ہوں۔ حاشا طبیعت میں اب نہ وہ روانی ہے نہ جذبات میں وہ گرمی۔ اُس غزل کے سوا جس کا مطلع اور مقطع آپ سُن چکے ہیں۔ نہ کوئی غزل لکھی گئی اور نہ کوئی زمین ہی ذہن میں آئی۔ امتثالاً وہی غزل پوری درج کر رہا ہوں۔

من بوفا مردم و رقیب بدر زد　　　　نیمہ بشش انگبیں و نیمہ نیشتر زد

خط (۸)

میر اعظم علی مدرس مدرسہ اکبر آباد کے نام

امروز نشتر ارہ بہ دماغم زدہ اند　　　　نشتر بہ رگ صبر و فراغم زدہ اند

از کثرت شور عطسہ مغزم ریش است　　　　تا عطر چہ فتنہ بر دماغم زدہ اند

مخدومِ معظم کی حیات افروز تحریر سے افسردہ جذبات میں ہل چل مچ گئی۔ اور دیرینہ آرزوئیں دل میں کھٹکنے لگیں۔ یاد آیا کہ اس خراب آباد میں کبھی میرا بھی ایک وطن تھا اور مہربانوں کی ایک انجمن آباد تھی۔ اس نشترِ پرسش کے قربان جایئے کہ برسوں کے زخم تازہ کر دیئے۔ آپ کے خیال کے بموجب اُس انجمن کو برہم ہوئے سولہ برس اور میری دانست میں بیس برس گذر چکے ہیں۔ بیس برسوں کی اس مدت میں عمر کا قافلہ کتنی ہی منزلوں سے گذر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ دہلی آنے کے بعد غفلت بیخودی و سرمستی کے کئی دور آئے اور گذر گئے۔ آخر اس بے راہ روی کا کچھ تو انجام ہونا تھا۔ بھائی کی دیوانگی کا غم ایک طرف اور قرض خواہوں کے

تقاضے دوسری طرف۔ لبوں پر مہرِ سکوت اور آنکھ نگاہ سے محروم۔ اسی شکستگی کے عالم میں بیدادِ روزگار سے تنگ آکر کلکتہ جا پہنچا۔ حاکموں کے مربیانہ اور ہمدردانہ سلوک سے دل کو تقویت ہوئی۔ بارے کشائشِ کار کی صورت نظر آنے لگی۔ ذوقِ بادیہ پیمائی دل سے رخصت ہوا۔ میخانۂ شیراز کی کشش جاتی رہی۔ دو سال یہیں ٹھہرا رہا۔ جب معلوم ہوا کہ گورنر جنرل بہادر دہلی تشریف لے جا رہے ہیں تو آگے آگے دوڑا گیا۔ اور دہلی پہنچا۔ مگر قسمت پھر برگشتہ ہو گئی اور بنا بنایا کام بگڑ گیا۔ اب چھ برس ہو چکے ہیں کہ سب کچھ کھو کر گوشۂ تنہائی میں پڑا ہوا ہوں۔ اور مرگِ ناگہاں کا منتظر ہوں۔ یہ ہے مرے مصائب کی مختصر کہانی۔ اس اندوہ و الم کے عالم میں اگر میں نے بزرگانِ وطن سے مراسلت میں کوتاہی کی ہے تو یقیناً قابلِ معافی ہوں۔ لیکن مرے دوستوں نے بھی تو اس ساری مدت میں پلٹ کر یہ نہ پوچھا کہ دوست ابھی تک جی رہا ہے یا مر چکا ہے۔

کس از اہلِ وطن غم خوارِ من نیست　　　　مرا در دہر پنداری وطن نیست

آپ نے لکھا ہے کہ آگرہ میں گورنمنٹ کی عدالتِ دیوانی کے دفاتر کھل گئے ہیں۔ شاید آپ یہ سمجھتے ہوں کہ غالب دادخواہ اس عدالت میں رجوع ہوگا اور اس کی بگڑی تقدیر سنور جائے گی۔ لیکن میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ اس جمعیت سے میری پریشانی کچھ اور بڑھ جائے گی۔ واللہ مجھے اب ان ہنگاموں سے کوئی سروکار نہیں۔ گورنمنٹ کی دادگاہ میرے حق میں تو "بیدادگاہ" ہے کہ اس کا حاکمِ اعلیٰ دردمند کُش ہے اور میں اُس کے خنجرِ بے داد کا کشتہ و بسمل ہوں۔

روزم سیاہ کردۂ چشمِ سیاہ اوست

اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ اس کے ہاتھوں مجھ پر جو کچھ گذری ہے۔ وہ حوادث روزگار کے سبب خود اس کے سامنے نہ آئے۔ مختصر یہ کہ دنیا سے اب کسی بھلائی کی امید نہیں رہی بس ایک اُمیدِ مرگ کا سہارا رہ گیا ہے۔

مخدوم زادہ میر وزیر علی کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اُس کا بچپن نظر کے سامنے پھر گیا اور دل سے اُس کی درازیٔ عمر کی دعا نکلی۔ خدا اسے اعلیٰ مرتبہ پر فائز کرے اور جامع گفتار و کردار بنائے   سلام با ہزاراں احترام

خط (۹)

مولوی کرم حسین خاں سفیر شاہ اودھ کے نام

قبلۂ حاجات!

برادرِ مشفق فخر الدولہ نواب امین الدین احمد خاں بہادر نے نوید قبول سنائی تو دل کو سپاس گزاری اور آپ کی کرم نوازی سے جرأت سوال کا حوصلہ ہوا۔ اس قطعہ کی نگارش سے مقصود یہ ہے کہ خسروِ عالی مقام سے روشناسی ہو اور ستائش گر کا مرتبہ ضمیرِ عالی پر روشن ہو جائے تاکہ اُس کے شایانِ صلہ عطا ہو۔ خوشامدیوں کی قدر اور مدح گستروں کی آبرو میں جو فرق ہے وہ آپ جانتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ سبحان علی خاں صاحب کو اس فرق کا اندازہ نہ ہو گا کیونکہ انہیں سائل کی خاکساری کی آبرو کا علم نہیں ہے۔ آپ سے گذارش ہے کہ قطعہ کے ساتھ راقم کے بارے میں اپنی رائے گرامی تحریر فرما کر بارگاہ خسروی میں پیش فرما دیں تاکہ نظرِ سلطانی میں میری

آبرو بڑھے اور گلِ مقصود ہاتھ آئے۔ ہر چند دریارِ اودھ کا پایہ اس سے کہیں بلند ہے کہ مجھ سا ناچیز اس کی تعریف میں لب کشائی کرے۔ لیکن اس جسارت کے جواز میں عرفی میرا ہم زبان ہے۔

زدود مانِ اصیلم ہمیں وہم بس یاد　　　کہ شرم ایں سخنم خوی ز چہرہ بیرون داد

یہ بھی میری خوش بختی ہے کہ میرا سابقہ صاحبِ خُلقِ عظیم و مردِ کریم مولوی سید کرم حسین سے ہے جو یقیناً اسد اللہ پر کرم نوازی سے دریغ نہیں فرمائیں گے۔

خط (۱۰)

سُبحان علی خاں کے نام

اے آنکہ ہمہ اسیرِ دامت باشد
صاف مے خسروی بجامت باشد
تسبیح بہ ہر اسمِ الہیٰ کہ بود !!
آغاز زابتدائے نامت باشد

خیال منتشر، زبان گرہ در گرہ، دل غم کا شکار، لب فریاد سے معمور، روزِ ازل پیمانۂ زندگی کی تلچھٹ میرے حصہ میں لکھی گئی اور زمانہ کی پیشانی کا داغ ہونا مقسوم ہوا تھا لیکن میری بلند ہمتی دیکھئے کہ اس افتادگی میں بھی میرا سر کسی آستانِ فلک نشاں پر جُھکا ہوا ہے اور اس خوش بختی پر جتنا ناز کروں کم ہے کہ طبیعت کو خانِ عالی شان کے التفات کے سوا کہیں اور منت پذیر ہونا گوارا نہیں۔ اب آرزو یہ ہے کہ یہ عرضداشت آصفِ ثانی

کی نگاہِ قبول سے گزرے، قصیدہ بارگاہِ سلطانی میں پڑھا جائے جس سے نگاہِ خسروی میں میری آبرو بڑھے اور اس کا صلہ مجھے اس طرح عطا ہو کہ دنیا میں بھی بلند نام ہوں اور خود اپنی نظر میں بھی وقیع۔ عقل کہتی ہے کہ اس آرزو کا بر آنا دشوار ہے۔ لیکن دل کہتا ہے کہ خانِ ارسطو تدبیر کی چارہ فرمائی کے آگے کوئی مشکل مشکل نہیں۔ شاہ اور وزیر کے فیض و کرم کی مثال پرتوِ مہر اور بارانِ رحمت کی سی ہے۔ جس کے فیض سے زمین کا ذرہ ذرہ جگمگا اٹھتا ہے اور بوٹا بوٹا نہال اور نمو پذیر ہوتا ہے۔ وہ اگر چاہیں تو اس پیاسے کو بھی سیراب کر سکتے ہیں جو پانی کی تلاش میں صرف ایک ٹوٹی چھلنی اور چادر لئے کنوئیں پر آیا ہو اور پانی نکالنا چاہتا ہو۔ بے سرو سامانوں کو سرو سامان عطا کرنا ان کے لئے کیا دشوار ہے۔ یہ مثال جو میرے احوال کا آئینہ ہے اظہارِ مدعا کے لئے کافی ہے۔ امید ہے کہ آپ کی توجہ اور الطاف سے محروم نہ رہوں گا۔

خط (۱۱)

نواب مصطفیٰ خاں بہادر کے نام

حضرت سلامت۔ زبان ستائش کے لئے بے قرار اور فکر اظہارِ ستائش میں دلیر ہے۔ حاشا یہ خوشامد نہیں۔ آپ کا مرتب کردہ تذکرہ بلاشبہ طاقِ بلندنامی کی زینت اور تشنگانِ ذوقِ سخن کے لئے آبِ حیات ہے۔ خضر کی رفاقت کے باوجود سکندر آبِ حیات سے محروم اور جگر تشنہ رہا لیکن نزدیک و دور کے سخن وروں نے آپ کے قلم کے اعجاز سے زندگیِ جاوید پائی۔

آپ نے ردیف الف میں حضرت آزردہ[۳] کے اشعار پروین نثار شامل نہیں کئے ہیں۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟ صرف آپ کے دیرینہ نیازمند ہونے اور آپ سے تعلق خاطر کی بنا پر میں نے یہ پوچھنے کی جسارت کی ہے۔ اس کے علاوہ ردیف الف ہی میں حضرت آشوب کا نام امداد علی بیگ لکھا ہے ——— حضرت آشوب کا اس شہر کے سادات گھرانے سے تعلق ہے۔ ان کا نام میر امداد علی اور ان کے والد کا نام نامی میر روشن علی خاں ہے۔ ان دونوں امور کے بارے میں جواب سے شاد کام فرمائیے۔ تذکرہ کے چاروں اجزا آپ کی خدمت میں واپس بھیج رہا ہوں۔ امید کہ تکمیل اور شیرازہ بندی کے بعد دوبارہ مرحمت فرمائے جائیں گے۔ والسلام۔

خط (۱۲)

نواب علی اکبر خاں متولی امام باڑہ کے نام

قبلۂ دیں و کعبۂ ارباب ایمان نواب والا مقام۔

دریا قطرہ سے آلودگی دور کرتا ہے اور مہر درخشاں ذرّوں کو تابندگی بخشتا ہے۔

آپ کے حوصلۂ حلم کا یہی شعور ہے جس کی بنا پر اظہار مدعا کی جرأت کر رہا ہوں۔ دل غم سے پارہ پارہ، ہر نفس نالہ، ہر نگاہ اشک۔ مرے شب و روز کا پہلے ہی سے یہ عالم تھا کہ زندگی کے پیالے میں کچھ اور تلخیاں گھل گئیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ

---

[۱] تذکرۂ گلشن بے خار۔ مرتبہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ
[۲] کیا کیا خضر نے سکندر سے۔ اب کسے رہنما کرے کوئی۔
[۳] مفتی صدر الدین آزردہ

فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ کے فرزند برادر والا قدر نواب امین الدین خاں بہادر نے چند دن ہوئے کلکتہ کا رُخ فرمایا اور مجھے اپنے نقشِ قدم کی طرح اس خراب آباد میں خاک بسر چھوڑ گئے۔ اُن کی جدائی سے دل پر جو کچھ گذر رہی ہے۔ زبان اُس کے شرح و بیان سے قاصر ہے۔ آپ سے صرف یہ گذارش کرنی ہے کہ برادرِ والا قدر جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوں تو ہر طرح اُن کی دلجوئی اور رہنمائی فرمائیے اور انہیں اپنے دامانِ الطاف میں اُسی طرح جگہ دیجیے جس طرح مجھے نوازا گیا تھا بلکہ مجھ سے زیادہ اُن پر لُطف ارزاں رکھیے۔ زیادہ نیاز —

خط (۱۳)

شیخ امام بخش ناسخ کے نام

مکرمی و معظمی۔

تسلیم و نیاز کا خلوص، اور جذبات شوق و آرزو کی فراوانی قدرتِ شرح و بیان سے کہیں زیادہ ہے۔ مختصر یہ کہ تقریباً دو مہینے گذرے دو اگست کو منتخب دیوان ریختہ موم جامہ میں لپیٹ کر انگریزی ڈاک کے ذریعہ خدمتِ گرامی میں بھیجا گیا تھا۔ مگر آج تک کہ ۲۶ جمادی الاوّل ہو چکی اور خدا جانے انگریزی کی کیا تاریخ ہے۔ دیوان کے پہنچنے کی جناب کی طرف سے اطلاع نہیں ملی۔ بار بار دل میں خیال آیا کہ اس خصوص

میں کارپردازانِ ڈاک سے بازپرس کی جائے۔ لیکن محض اس خیال سے چپ ہو رہا کہ یہ محکمہ صرف ڈاک پہنچانے کا کفیل ہے۔ حصول جواب کا ذمہ دار نہیں۔ اگر کوتاہ قلمی احباب کی طرف سے ہے تو اس میں ڈاک والوں کا کیا قصور اور بازپرس کا کیا فائدہ۔ خدا کے لئے نوید وصول اور بشارت قبول سے آگاہ فرمائیے۔ والسلام والاکرام

خط (۱۴۰)

صاحب عالم مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر کے رقعہ کے جواب میں عرضداشت

بہ حضور فیض گنجور حضرت صاحب عالم عالمیان دام اقبالہ وزاد اجلالہٗ۔

جس طرح ذرہ مہر عالم تاب سے نور اور قطرہ دریائے بیکراں سے آبرو پاتا ہے اسی طرح حضور کی ذرہ نوازی نے اس ہوا خواہ کو زندگی دی اور حوصلۂ سپاس بخشا۔ کسی قالب کو ایک سے زیادہ جان نہیں ملتی۔ مجھے بھی ایک ہی جان عطا ہوئی ہے اور اس ایک جان سے الطافِ خسروی کے سپاس کا حق کس طرح ادا کر سکتا ہوں۔ عرش پیمائے اعظم کی خاکِ پا کی سوگند کہ اگر دل اپنی جگہ پر ہوتا اور ہوش و حواس ٹھکانے ہوتے تو منشورِ خسروی کی تعمیل میں سر کے بل آستانہ عالی پر حاضر ہوتا۔ خاں صاحب مشفق سید قاسم علی خاں واقف ہیں کہ خانہ زاد ان دنوں کیسے کیسے مصائب و آلام کا ہدف بنا ہوا ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو اس عرضداشت کی تحریر کے دوسرے ہی دن تعمیل حکم میں چل پڑتا۔ اتفاقاً جس کی خدمت میں پہنچا ہے۔ وہ خود آج کل شہر سے باہر ہے، ور صبح کہیں شام کہیں رہتا ہے۔ سید قاسم علی خاں خانہ زاد کے منع کرنے کے باوجود راہ دراز طے کر کے

پانی پت گئے اور حاکم کے وہاں موجود نہ ہونے کی وجہ سے انہیں واپس ہونا پڑا۔ ناچیز نے ضروری امور خاں صاحب کے گوش گذار کر دیے ہیں۔ اگر وہ ان پر عمل کریں تو کار ہائے ضروری حسب دل خواہ تکمیل کو پہنچیں گے۔ زیادہ حدِ ادب

خط (۱۵)

نواب مصطفیٰ خاں بہادر کے نام

مخلص نواز!

والا نامہ نے سرفراز کیا۔ آپ کی بزرگی اور خوش خلقی سے شرمسار ہوں۔ بے ہے۔ کیسی لغزش۔ کس کی شاگردی اور کہاں کی رہنمائی۔ اگر کوئی غلطی بھی تو میری اپنی نگارش کی تھی۔ گزارش کی نہیں۔ مسودہ نظر سے گزرا تو سوادِ نظر کی ——— تیرگی روشن ہو گئی۔ میں نے جو کچھ عرض کیا تھا وہ میر امداد علی خاں کی وکالت تھی۔ اگر کوئی منت ہے تو ان پر ہے نہ کہ آپ[۱] کے خادموں پر۔ تقریظ بہ تقاضائے مہر لکھ رہا ہوں اور اس بہانے آپ کی ستائش کی دیرینہ آرزو کی تکمیل کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کے جہانگیر آباد سے واپس تشریف لانے تک یہ مکمل ہو جائے گی۔ یوں تو آپ کے جہانگیر آباد جانے سے پہلے ہی دو دن کی فرصت میں دو ایک ورق لکھ لینا دشوار نہ تھا۔ لیکن آج کل دل کچھ گھبرایا ہوا سا ہے۔ زبان گویا رائے سخن نہیں ہے اور چند در چند موانع درپیش ہیں جن کی وجہ سے طبیعت یکسو نہیں ہے۔ ایک تو برادرِ عزیز

---

[۱] سرورِ کائنات۔

مرزا علی بخش خاں جے پور سے علیل ہو کر آئے ہیں اور میرے ہی گھر میں مقیم ہیں۔ دوسرے نواب احمد بخش مرحوم کی معاش شاملہ جاگیر کا مسئلہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ ایک طرف مریض کی تیمارداری کی ذمہ داری تو دوسری طرف ذہن چارہ جوئی میں الجھا ہوا ہے۔ تذکرہ کے اجزا واپس کرتے ہوئے ایک گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ مرزا احمد بیگ خاں تپاں مرحوم سے میری ملاقات کلکتہ میں ہوئی تھی۔ میرے ان سے یکدلی کے مراسم تھے۔ اُردو میں شعر کہتے تھے اور مرزا جان تپش کے شاگرد تھے۔ رنگِ کلام سادہ تھا۔ کلکتہ کے قیام کے دوران جب میں نے انہیں بتایا کہ نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرورؔ اُردو شاعروں[1] کا تذکرہ مرتب کر رہے ہیں تو تپاں مرحوم نے مجھے اپنا منتخب کلام عنایت کیا تھا تاکہ میں اسے دلی ساتھ لیتا جاؤں اور سرورؔ کے حوالے کر دوں۔ چنانچہ دہلی میں وہ اوراق میں نے سرورؔ مرحوم کے حوالے کر دیے تھے۔ غالباً سرورؔ مرحوم کے ذہن سے یہ بات نکل گئی اور وہ اوراق ان کے تذکرہ میں شامل ہونے سے رہ گئے۔ افسوس ہے کہ مجھے خود ان کا کوئی شعر یاد نہیں رہا۔ اگر آپ زحمت فرما کر ان اوراق کو سرورؔ مرحوم کے فرزندانِ گرامی نواب مصطفیٰ خاں یا نواب احمد خان سے حاصل کر کے اپنے تذکرے[2] میں شامل کر لیں تو یہ مجھ پر احسان ہو گا۔ والسلام۔

خط (۱۶)

حکیم احسن اللہ خاں کے نام

دردمند نوازا۔

---

[1] تذکرہ عمدۂ منتخبہ۔ از نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرورؔ۔

[2] معلوم ہوتا ہے کہ یہ اوراق شیفتہ کو نہ مل سکے۔ اسی لئے گلشن بے خار میں احمد بیگ تپاںؔ کا ذکر نہیں ہے۔ عبدالغفور نساخ کے تذکرے میں تپاں کا ذکر اور کلام شامل ہے۔

آپ کے گرامی نامہ سے یہ روشن ہوا کہ خاطر احباب سے ابھی مری یاد مٹی نہیں ہے۔ آپ نے مجھ سے میری نثر طلب فرمائی تو مجھے اپنی حالت اس بے مایہ میزبان کی سی نظر آئی جس کے گھر ناگاہ کوئی مہمان عزیز وارد ہوا اور وہ بے چارہ پریشان ہو کر اپنا ناکارہ سامان ٹٹولنے لگے کہ کوئی چیز بیچ کر مہمان کے لئے جو کی روٹی اور شوربے کا ایک پیالہ فراہم کر سکے۔ خدا گواہ کہ اپنی نثر کو مرتب و محفوظ کرنے کا مجھے کبھی خیال تک نہیں آیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری نثر ادنیٰ ہے یا اعلیٰ۔ بالفرض اگر وہ انشا کا اعلیٰ نمونہ بھی ہو تو اسے مرتب و محفوظ کرنا میرے نزدیک کار رائیگاں ہے۔ متقدمین کو کیا مل گیا اور اپنے ساتھ وہ کیا لے گئے۔ جب صورت یہ ہو تو آدمی بے کار تردد کیوں کرے۔ جہاں قتیل[1] کی فرہنگ مستند سمجھی جائے اور نورالعین واقف[2] کی فصاحت کے جھنڈے گڑے ہوں وہاں ہماری انشا کی قدر کیا ہوگی۔ چند سطریں جو دیوان ریختہ موسوم بہ گل رعنا کے دیباچے کے طور پر لکھی ہیں بھیج رہا ہوں اور اپنی تنگ مائگی پر شرمسار ہوں۔ والسلام۔

خط ۱۷ ۱۱

ایک دوست الف بیگ کے نام

مہربان دوست!

بے وقت نہال امید کا بار آور ہونا یعنی پیرانہ سالی میں فرزند کا تولد ہونا

---

[1] محمد حسین تبریزی قتیل صاحب برہان قاطع یا محمد حسین قتیل فرید آبادی تعلیقات دیکھئے۔
[2] نورالعین۔ واقف تعلیقات دیکھیے۔

مبارک ہو۔ آپ نے مجھ سے نومولود کا نام تجویز کرنے کی خواہش کی تو بغیر کسی زحمت فکر کے یہ قطعہ زبان پر آگیا۔ جسے سپردِ قلم کر رہا ہوں۔ خدا یہ نام مبارک کرے اور یہ سعادت مند آپ کی زندگی ہی میں آپ کی عمر کو پہنچے اور آپ کے بعد بھی تا دیر زندہ و سلامت رہے۔

چوں الف بیگ در کہن سالی — پسرے یافت سر بسر نغزہ
نامِ اُو ہمزہ بیگ کرد، بلی! — الف منحنی بُود ہمزہ

یارانِ انجمن آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ کبھی ادھر کا بھی رخ کیجئے۔

خط (۸۱)

سبحان علی خان بہادر کی خدمت گرامی میں

مرے لئے یہ شرف کیا کم ہے کہ روئے سخن جناب کی طرف ہے اور خدمتِ گرامی میں یہ نیاز نامہ بھیج رہا ہوں۔ بقول ظہوری ۔

گرچہ خوردیم نسبتی ست بزرگ
ذرّۂ آفتاب تابانیم

دل و زبان تہنیت گزاری کے آرزومند ہیں لیکن عقل کہتی ہے ۔ خبردار! ممدوح کے فضل و کمال کی ستائش کا حق ارسطو اور بوعلی ہی ادا کر سکتے ہیں۔ قلم اظہارِ نیاز کی جسارت پر آمادہ ہوتا ہے تو دل سے آواز آتی ہے۔ اپنی حد سے نہ بڑھنا کہ عطارُد و مشتری اس آستانۂ عالی کے دربان ہیں۔ پس فقیر کے

لئے یہی بس ہے کہ عرضِ نیاز سمعِ عالی پر گراں نہیں ہے۔ اس سے بڑھ کر آبرو مندی اور کیا ہوگی۔

خط (۱۹)

مبدأ حاجات سخن وراں و کعبۂ اُمید ثنا گستراں سلامت!

قصیدہ اور عرض داشت کو خدمتِ گرامی میں پیش ہوئے کافی دیر ہوئی۔ معلوم ہوا تھا کہ ابیات وزیر اعظم کی نگاہِ عالی سے گذر چکے ہیں۔ نویدِ قبول و التفات فروغِ نظر کا منتظر ہوں۔ طالع نارسا کے باوجود جناب کی بارگاہ عالی سے آستانہ وزارت تک میرا قصیدہ پہنچ چکا ہے تو دربارِ خسروی تک اُس کی رسائی میں کیا دیر ہے۔ دل میں سخن ہائے گفتنی بہت ہیں جو بے کہے بھی ضمیرِ عالی پر روشن ہوں گے۔

فصلے از بابِ شکستِ رنگِ انشا کردہ ام
می تواں رازِ درونم خواند از سیمائے من

خط (۲۰)

شیخ امام بخش ناسخ کے نام

قبلہ و کعبہ۔ دل فسردہ ماندگی اور افسردگی سے خُوگر تھا۔ لیکن کیا بتاؤں کہ میرے نے آج کیا دیکھا کہ نگاہ اس دید پر ناز فرما اور قلم فرطِ شادی سے انگلیوں میں رقصاں

ہے۔ اپنے بخت رسا پر ناز کر رہا ہوں کہ آج طورِ معنی پر میرا گذر ہوا اور میں نے موسے کو ید بیضا کے ساتھ دیکھا۔ آپ کو شاید حیرت ہو کہ یہ کیسی شیخی اور خود ستائی ہے ! لیکن یہ کوئی لاف و گزاف نہیں بلکہ ایک کنایۂ سخن ہے۔ موسیٰ سے میرا اشارہ مکرمی میر موسیٰ جان کی طرف ہے اور ید بیضا سے مراد جناب کا نظر افروز دیوان ہے۔ جسے وہ اپنے ساتھ لائے ہیں۔ دیوان کیا ہے قلزمِ معنی کا سفینہ اور گوہرِ مضمون کا گنج ہے۔ اس کی روشنائی دُودِ چراغِ طوُر سے بنی ہے اور اس کا غلاف زیبائی میں حُلۂ حوُرِ بہشتی کے مانند ہے۔

دیوان کے ساتھ گرامی نامہ نے مفتخر کیا۔ یہ دوسرا کرم نامہ ہے جو مجھے ملا۔ اگر پہلا خط دلپذیر نہ ہوتا تو اس خط کی دنیا میں نظیر نہ ہوتی۔ گویا نامۂ اوّل نے پہلے ہی سے اس کا مداوا کر دیا تھا کہ اس کو نظر نہ لگے۔

سبحان اللہ آپ کے بلند پایہ کلام نے اُردو شاعری کو کیا رونق اور تازگی عطا کی ہے۔ میرا نیاز نامہ نہ ملنے پر خاطرِ عالی کو ملال ہوا۔ جس کا گرامی نامہ میں شکوہ فرمایا گیا ہے۔ اس شکوہ سے میری عزت افزائی ہوئی اور نظر میں خود اپنی وقعت کچھ بڑھ گئی۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ کو اپنے نیازمند کا اتنا خیال ہے۔ اِس نوازش و پرسش پر جتنا شکر بجا لاؤں کم ہے۔ ہر چند دِل رہینِ ستم ہائے روزگار ہے۔ لیکن یقین فرمائیے کہ دوست کی یاد سے غافل نہیں۔ اِس سے پہلے خدمت گرامی میں دو نیاز نامے بھیج چکا ہوں۔ مجھے پہلے ہی سے اندیشہ تھا کہ شاید میرے خط آپ تک پہنچ نہ پائیں۔ کیونکہ یہ خط ہندوستانی ڈاک کے ذریعہ بھیجے تھے اور یہ محکمہ قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ اندیشہ درست تھا۔ اَب میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اس کے بعد

صرف انگریزی ڈاک کے ذریعہ خط بھیجا کروں گا۔

یہ عریضہ حضرت میر موسیٰ جان کے سپرد کر رہا ہوں تاکہ نہ پہنچنے کی صورت میں میری نیاز مندی پر حرف نہ آئے اور میر صاحب اس کے گواہ رہیں۔ ایک تازہ غزل جو روشِ تازہ پر کہی ہے پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ امید کہ نظرِ قبول سے محروم نہ رہے گی۔

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بُرافگنم　　　در بزمِ رنگ و بُو نمطی دیگر افگنم

خط (۲۱)

مولوی نورالحسن کے نام

جاں بر سرِ مکتوب نواز شوق فشاندن
از عہدۂ تحریر جوابم بدر آورد ! !

یہ کیسی سرخوشی اور کس جلوے کی بہار آفرین ہے کہ درِ میکدۂ سخن کھلنے لگا اور رُوح لذتِ گفتار سے سرشار ہونے لگی۔ تمہاری تحریر نے دل و نظر کو فرحت بخشی، اور تمہاری سعادت مندی پر غالبِ وفا پیشہ کے دل سے دعائیں نکلیں۔ کلکتہ کے دن یاد آگئے اور تمہارے والدِ محترم کے الطاف، تمہاری فرزانگی اور سراج الدین احمد خاں کے خلوص و محبت کا نقش دل پر گہرا ہوگیا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے نثر نگاری کی طرف توجہ کی ہے اور اس میں ایک روشِ خاص اختیار کرنا مقصود ہے۔ مجھے اس وقت تمہارا بچپن یاد آرہا ہے۔ یاد وہ دن تھے کہ کلکتہ میں تم ننھے سے بچے تھے اور لکھنے

پڑھنے سے جی چراتے تھے اور آج شوقِ علم ہے کہ تمہیں کشاں کشاں منزلِ آگہی کی طرف لئے جا رہا ہے۔ گویا ایک ننھا بُوٹا دیکھتے ہی دیکھتے نخل بار آور بن رہا ہے۔ بھائی یہ مہینے کے مہینے اپنی نثر بغرضِ اصلاح بھیجنے کا خیال چھوڑ دو۔ تمہاری شاگردی یقیناً مرے لئے موجبِ مسرت ہے۔ لیکن اتنے فاصلے سے رہنمائی ممکن نہیں۔ رُوبرو رہنمائی میں اور مراسلت کے ذریعہ اصلاح میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ لفظ لفظ کی نوک پلک بنانا۔ ایک ایک لفظ کو عبارت میں سے چُن چُن کر اُس کی جگہ دوسرا لفظ رکھنا۔ بھلا یہ کام دُور بیٹھے کیوں کر ہو گا۔

میرے ایک عزیز دوست نے میری نگارشاتِ نثر کو مرتب کرکے چھاپا ہے میں اس کا ایک نسخہ تمہیں بھیج رہا ہوں۔ شاید اس سے تمہیں میری روش کا اندازہ ہو۔ اور تحریر میں کوئی مدد ملے۔ یہ کیا کہ تم نے اپنے پتے میں صرف احاطۂ خانساماں لکھا۔ مانا کہ اُس شہر میں تمہارا گھرانا خاصا معروف ہے اور انگریزی ڈاک کے کارپرداز سب نہیں جانتے ہیں۔ لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ شاید یہ پتہ ادھورا ہو۔ اسی وجہ سے تمہارا جواب آنے تک میں نے کتاب نہیں بھیجی تھی۔ تمہارے والدِ محترم کی خیریت معلوم کرکے دل کو بہت سکون و اطمینان ہوا۔ اُن کی خدمت میں میری طرف سے سلام نیاز اور مولوی عبدالقادر صاحب کو جن کا میں غائبانہ ارادت مند ہوں، میری بندگی پہنچا دینا اور کریم خاں صاحب سے بھی کہنا کہ شوقِ دید کی بے چارگی کے سبب سلامِ حسرت پر قناعت کر رہا ہوں۔ اور اس دغا دشمن مگر بظاہر دوستِ صادق، گُل محمد ناطق کے بارے میں کیا، کہوں جس نے آج تک نہ پیام زبانی ہی بھیجا نہ خط ہی لکھا۔ بہت دنوں سے دل کو اس کی طرف سے تردّد تھا۔ اب اِس نے سلامِ خشک بھیجا ہے سو وہ بھی محض بسبیلِ اتفاق

ہے۔ از روئے اشتیاق نہیں۔ تم اس کا سلام اُس کو ٹادو مگر در پردہ اِس کا حال لکھ بھیجو کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔

میں نے مولانا علی اکبر شیرازی کے کمالات کی شہرت سنی ہے اور اُن کا غائبانہ عقیدت مند اور اُن سے ملاقات کا آرزومند ہوں۔ اگر مجھے اُن کے شایان التفات ہونے کا یقین ہوتا تو یقیناً اُن کی خدمت میں نیاز نامہ روانہ کرتا۔ لیکن اپنی خاکساری پر میری نظر ہے اور گمنامی کو رسوائی سے بدلنا طبیعت کو منظور نہیں۔ ایک نئی غزل بھیج رہا ہوں۔ یہ انہیں دکھا کر کہنا کہ یہ ایک ہندوستانی کا اندازِ سخن ہے۔ اگر یہ غزل انہیں پسند آجائے تو مزید کلام بھیجوں گا۔

خط (۲۲)

مولوی حافظ محمد فضل حق کے نام

قبلہ و کعبہ۔ بھلا لاالہ ہیرالال جمعرات ۲۵ ربیع الاول کو اتفاقاً مری طرف نہ آنکلتے تو آپ کے پڑوس میں آگ لگنے کی خبر اور اس سے آپ کے خادموں کے محفوظ و مصئون رہنے کی خوش خبری مجھے کیسے ملتی اور میں اپنی نیاز مندی اور غمخواری کے فرض سے کیوں کر عہدہ برآ ہوتا! حضرت یہ کیا ستم ہے کہ بیگانے تو کامیاب نامہ و پیام ہوں اور نیاز مند خیریت کے دو لفظوں کے لئے ترستے رہیں۔

وائے بر من کہ رقیب از تو بہ من بنماید
نامۂ وا شدۂ مہر بہ عنوان زدہ!

غرض یہ تحریر مرے اضطرابِ درُوں کا آئینہ ہے۔ جذبۂ مہر و وفا کی تاثیر کا دل کو یقین تھا۔ اِس لئے شکایت کی جسارت ہوئی۔ خیر شکوہ شکایت برطرف خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے اِس بلا سے آپ کو بچا لیا۔ بے بصروں کو بصیرت ملی اور اہلِ نظر کو رحمتِ الہٰی اور معجزۂ آسودگیٔ خلیل کی شان نظر آئی۔ خدا آپ کو ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ یہ بتایئے کہ پڑوس میں آگ لگنے کی آپ کو کب خبر ہوئی اور اِس وقت آپ اور عزیز گرامی عبدالحق کہاں تھے اور گھر والوں پر کیا گزری تھی۔ آپ کے گھر کے قریب کے کارخانہ کا ساز و سامان کتنی دیر جلتا رہا اور آگ کو پھیلنے سے کِس طرح روکا گیا۔ اُمید کہ جواب سے محرُوم نہ رہوں گا۔

خط (۲۴)

نواب مصطفیٰ خاں بہادر کے نام

مُردم ز فرطِ ذوق و تسلّی نہ می شوم   یارب کجا برم لبِ خنجر ستائے را

آج صبح کے وقت شانہ کے درد سے دل اُسی طرح بے قرار تھا۔ جس طرح مومن مہر پیشہ ہمسائے کی تکلیف سے مضطرب رہتا ہے۔ اِسی حالت میں نامہ بر نے آپ کا خط دیا۔ یہ خط کہ مسِ اُمید کے لئے کیمیا، سوادِ نظر کے لئے روشنی، جبینِ اقبال کے لئے تاج اور پیکرِ آرزو کے لئے زیور ہے۔ شعر و غزل سے اِسی طرح خالی ہے جس طرح زاہد کا نامۂ اعمال ذکرِ شاہد و مے سے خالی ہوتا ہے۔ یہ تسلّی بقدرِ شوق اور نشہ باندازہ خمار نہیں۔ ہے ہے نہ مژدۂ دیدار کہ دِل کو قرار آئے نہ کرشمۂ غزل کہ

جناب نواب صاحب۔ یہ رسمِ ترکِ نامہ و پیام کیسی! اگر یہ بے پروائی ہے تو نازیبا ہے اور اگر شکیب آزمائی ہے تو اس کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اگر میری ناکسی شایانِ التفات نہیں تو پھر خاکساروں کو لب کشائی کی جسارت بخشنا اور بے نواؤں کے شکوے مول لینا آپ کے شایان کب ہے! اگر یہ تغافل بے محابا اور فراموش کاری میرے جرمِ خاموشی کا ردِّ عمل ہے تو گلہ نہ کرنا اور مجھے معذرت کا موقعہ نہ دینا کس کا قصور ہے؟ کون سا خط آپ کا آیا تھا کہ میں نے جواب نہیں دیا اور کس راہ گذار سے شمیمِ دوست آئی تھی کہ میں نے اس پر اپنی جان نثار نہیں کی۔ میں خود ان دنوں کثرتِ آلام سے اس قدر رنجور و ملول ہوں کہ حرفِ سخن طبیعت پر گراں ہے۔ جب تک اُدھر سے کوئی نظر افروز نامہ نہ آئے یا کوئی نشاط انگیز غزل نہ پہنچے۔ اپنی فکر کو گرداب خوں سے کیوں کر نکالوں اور سپاس گزاری کا حق کس طرح ادا کروں۔

چہ نویسم بہ تو در نامہ کز انبوہِ غم !
نیست ممکن کہ روانی ز عبارت نہ رود

درماندگی کی داستان سنائی تو جا سکتی ہے لکھی نہیں جا سکتی۔ دل ہم زبانی کا آرزو مند ہے۔

خط (۲۶)

مولوی ولائت حسین خاں کے نام

خط نہ لکھنے کی معذرت اور قاضی القضاۃ کے عہدہ پر ماموری کی مبارکباد۔

شبگیر مرا ز دوشنی اخترمن بس   در راہ ادب حسن طلب ببر من بس

دنیا کا یہ آئین کہن ہے کہ آقا اگر بندے سے ناراض ہو جائے اور وہ شخص اپنے کردار و گفتار میں دلآویز ہو تو وہ اپنے مخدوم کی خاطرِ عالی سے زیادہ دیر دور نہیں رہتا۔ خواجہ کے مقربین کی سفارش پر ذرا سی گوشمالی کے بعد اُس کی خطا معاف ہو جاتی ہے اور بزمِ اُنس میں اُسے دوبارہ جگہ مل جاتی ہے۔ مگر کوئی بندۂ کم خرد جس کا شیوہ بسیار گوئی اور دشوار جوئی ہو جب کسی خاطرِ عالی سے گر جاتا ہے تو پھر اس کا کہیں ٹھکانا نہیں ہوتا۔ میں بھی ایسا ہی بندۂ بدبخت ہوں جس کے غوغائے شب دردزا اور ننگ ہمدمی سے آقا اور اُس کے ندیموں کو نجات مل گئی اور اب اُن کے نزدیک اُس کا جینا اور مرنا دونوں برابر ہیں۔ بہر حال مجھے اس کا احساس تھا کہ یہ محرومیِ التفات خود میرے اپنے عمل کی مکافات ہے۔ چنانچہ اسی ندامت اور شرمساری کے سبب معذرت خواہی کا حوصلہ نہ ہوا۔

زیں کہ دیدی بہ جحیم طلب رحم خطاست

سخنے چند ز غم ہائے نہانی بشنو!

دل ندامت و شوق کی اسی کشاکش میں مبتلا تھا کہ میر سید علی کی زبانی گورنر بہادر الہ آباد کی آمد کی خبر اور جناب کے ترقیِ درجات کی اطلاع ملی اور دل ادائے مراسمِ تہنیت اور اظہارِ عقیدت و نیاز کے لئے بے تاب ہونے لگا۔ منصبِ قاضی القضاتی ترقی طلبوں کی معراجِ کمال ہے۔ خدا آپ کو یہ منصبِ عالی مبارک کرے۔ اُمید کہ آپ میرے جرمِ کوتاہ قلمی سے درگذر فرمائیں گے۔

مؤرخہ یکم جنوری ۱۸۳۰ء

خط (۲۷)

مولوی محمد صدرالدین خان صدرالصدور کے نام

قبلۂ حاجات!

اگر مجھ سے اونچا سننے والے، بسیار گو، زود گستاخ اور بے مایہ نیاز مند کو حق بندگی نہیں تو اور کس کو ہوگا؟ - اقبال نشان مرزا زین العابدین خان کی سفارش پر جناب نے مرزا اسد بیگ کی جو استعانت فرمائی اس کی خبر مجھے ملی اور دل اس رشک سے جلنے لگا کہ آخر میری نیازمندی کب درخورِ اعتنا ہوگی۔ آپ سے میری گذارش ہے کہ مرزا اسد بیگ کی کارسازی میں جو عنایت صرف ہوئی ہے۔ اس کا باقی حصہ مرزا افضل بیگ کو مل جائے۔ چاہے یہ 'صرف' اسراف ہی کیوں نہ ہو اور اس لطفِ ارزانی کے بعد خود میرے لئے کچھ باقی نہ رہے۔ خدا آپ کی عمر و دولت میں ترقی دے۔

خط (۲۸)

شیخ امیر اللہ سرور کے نام

حضرت سلامت۔ نامۂ دلنواز ملا۔ کیا خوب آپ کو گلہ ہے کہ میں نے آپ کے خطوں کا جواب نہیں دیا۔ خدا را ذرا انصاف سے کام لیجئے۔ میں خود کتنے دنوں سے آپ کی طرف سے فکرمند تھا کہ کہاں ہوں گے اور کیسی گذر رہی

ہو گی۔ اب معلوم ہوا کہ تراب علی صاحب سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی اور اُن کی زبانی آپ نے سنا کہ غالب سخت جان ابھی زندہ ہے۔ پرانی مروت نے اثر کیا اور دل میں خط لکھنے کا خیال آیا تو اپنی پچھلی بے مروتی پر پردہ ڈالنے کے لئے چند جھوٹ تراش لئے اور انہیں تمہیدِ خط بنا لیا۔ خیر خدا آپ کو تا دیر سلامت اور خوش رکھے۔ آپ نے میرا حال پوچھا ہے۔ حال کیا بتاؤں کہ گفتنی نہیں رہا

شکستہ دل تر ازاں ساغرِ بلوریم !!
کہ درمیانہ خارا کنی زدرد رہا !

دل و دماغ اپنی جگہ پر نہیں۔ چار سال سے کونسل کے اجلاس میں مقدمہ پیش ہے اور فیصلہ ہونے نہیں پاتا۔ عجیب اُمید و بیم کا عالم ہے۔ سوچتا ہوں کہ لارڈ ولیم کونڈس بنٹنگ جب اِدھر آئیں تو ان کا دامن تھام کر دادخواہی کروں اور حکمِ آخر کے لئے استدعا کروں۔ مگر بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ نواب عالی جناب دہلی نہیں آئیں گے اور اُدھر ہی اُدھر اجمیر چلے جائیں گے۔ اگر یہ سچ ہے تو چارہ سازی معلوم!

آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے نتائجِ فکر کو دیکھ کر اپنی گزارشات کے ساتھ انہیں آپ کی خدمت میں واپس کر دوں۔ بھائی آج کل اس کی فرصت کہاں اور دماغ کیسے! گورنر بہادر کی آمد آمد ہے۔ مقدمہ کے سلسلہ میں فکر، تلاش، نگارش و ترتیب کے کئی مرحلے درپیش ہیں۔ کوئی ایسا نہیں کہ جو لکھوں اس کی نقل کر دے۔ واقعات کی چھان بین کے سلسلے میں جو کاغذات منتشر ہو جائیں انہیں پھر یکجا کر دے اس لئے مجھے چند دنوں کے لئے معاف رکھو اور اس دوران آئینۂ دوستی پر زنگ نہ آنے دو۔

اوراق اشعار سرسری دیکھے۔ جن افراد کا کلام اس مجموعہ میں شامل ہے۔
اُن میں میں نے مرزا حیدر علی افصح کو کامل پایا اور اُن کی روش پسند آئی کہ یہی انداز
شیخ امام بخش ناسخ، خواجہ حیدر علی آتش اور دوسرے تازہ خیالان لکھنو کا ہے
اُن کی ایک غزل دیکھی جس پر مخمس لکھا ہے۔ حسن مطلع کے پہلے مصرعہ کے رُکن آخر میں
زحاف واقع ہوا ہے۔ جسے عروضیوں کی اصطلاح میں عجز کہتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ آپ کا
تصرف ہے یا سہو کاتب۔ شعر یوں ہونا چاہیئے۔

نہ خریدار کا حصہ ہوں نہ حق بائع کا
میں وہ دانہ ہوں جو گر جائے کفِ میزاں سے

والسلام

خط (۲۹)

مومن خاں صاحب کے نام

آپ کا طالع گفتار روشن رہے! کل فکرِ جنوں پیشہ ستاروں سے
برسرِ پیکار تھی اور میں اپنی قسمت کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ یہ چار مصرعے تیغ دودم کی صورت
زبان پر آئے۔ جنہیں میں نے گردش آسمان کی نذر کر دیا۔

آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقئ دہر ریزد ہمہ دردِ درِ تلخابۂ زہر
بگذر ز سعادت و نحوست کہ مرا ناہید بغمزہ کشت و مریخ بقہر

ذرا سادگی دیکھیے کہ ابھی احساس کی یہ تلخی مٹی نہیں تھی کہ دل کا تقاضا ہوا

کہ اگر اس سال کی تقویم پوری لکھی جا چکی ہو تو اک نظر اس کو بھی دیکھئے اور اپنے خورشید کی تابانی پر ناز کیجئے۔ دل بھی کیا نادان ہے کہ اس سیہ روزی کے باوجود ستاروں سے خوش بختی کی آس لگائے بیٹھا ہے۔ اس کی مثال اس کمسن اور بھولی بھالی کنیز سی ہے جو عید سے پہلے ہی ترنگ میں آکر گانے لگی کہ عید آگئی۔ عید آگئی۔ اس پر کسی نے کہا کہ نیک بخت اگر عید رمضان ہی میں آگئی ہے تو تیرے حصہ کی ادھ جلی روٹی تو کہیں نہیں گئی۔

مختصر یہ کہ خط بھیج رہا ہوں اور دعا کر رہا ہوں کہ الٰہی نامہ بر خالی ہاتھ نہ لوٹے۔ پاس ادب ملحوظ ہے اور آستانِ دوست کو بلندی میں آسمان کے برابر سمجھتا ہوں۔

والسلام۔

خط (۳۰)

نواب مصطفیٰ خاں

جناب عالی :-

دو تین دن سے جگر ذوق ہم زبانی سے تشنۂ نامہ نگاری اور طبیعت بہانہ جُو ہے۔ دست و قلم میں آویزش اور قلم روانی میں صفحہ سے دل تنگ۔ شوق نہ ٹلنے والے سائل کی طرح دل سے متاع جاں کا طالب اور دل کریم مفلس کی طرح شوق سے شرمسار۔ اس کشمکش میں میں خود حیراں ہوں کہ کیا لکھوں کہ دامن سرمایہ تحریر سے خالی ہے گرمی کا یہ عالم ہے کہ اس کا ایک شمہ بھی لکھنا چاہوں تو قلم میں آگ لگ جائے۔ کاغذ سلگ اٹھے اور نامہ بر جھلس کر رہ جائے یہاں ایک خبر اڑی ہوئی ہے کہ شاہ ایران

روسیوں سے مل کر ہندوستان کا قصد کرنے والے ہیں۔ سو یہ محض افسانہ ہے اور درخورِ اعتنا نہیں۔ آپ کی طرف سے کوئی گرامی نامہ ہی آتا کہ سپاس گذار ہوتا۔ کوئی غزل ہی نظر نواز ہوتی کہ اس کی تحسین پیش کرتا۔ اِدھر میں نے بھی کوئی غزل نہیں کہی کہ اُسے ملاحظۂ عالی میں گزارتا۔

گفتگوئے مہر و وفا سے زبان نامحرم اور داستانِ اشتیاق کے لئے بیان نارسا ہے اور یہی وجہ میری خاموشی کی ہے۔

خط (۳۱)

نواب مصطفیٰ خاں

ولی نعمتِ طوطیانِ شکرخوار سلامت۔

ابھی نامۂ بہاریں کی نکہتوں سے رُوح سُرور آگیں تھی کہ نخلِ برومند سے عنایتوں کی ثمر افشانی ہونے لگی۔ یعنی آموں کے آٹھ ٹوکرے وصول ہوئے۔ سبحان اللہ کیا آم ہیں۔ باہر دودھ سے دھلے ہوئے۔ اندر شکر میں گھلے ہوئے۔ جن کو چشمۂ خضر سے پانی اور نفسِ مسیح سے تازگی ملی ہے۔ جو "شیرینی" میں شکر سے بازی لے گئے اور جنھوں نے خود خسرو کا بھی دل موہ لیا (جو اپنی شیریں کا دلدادہ تھا) یہ آم پاکیزگی میں گوہر آبرو اور دلآویزی میں یکتا ہیں۔ ابرِ نیساں نے جب تک اِن آموں کی آبیاری نہیں کی۔ اِس سے زبانِ گہر سازی کی تلافی نہ ہو سکی۔ اگر انگور یہ جانتا کہ بادۂ ناب اور چیز ہے اور یہ شیرینی اور حلاوت اور تو برومند ہونے کے خیال سے دستبردار ہو جاتا تاکہ بالآخر اُس

کی برومندی کا انجام خلق کے تتے درد سر کے سوا کچھ نہیں۔ اگر نیشکر کو شروع ہی سے علم ہوتا کہ سخت مراحل اور زحمتوں سے گزرنے کے بعد بھی وہ حلاوت اور شیرینی جو آم ہی کا حصّہ ہے اُس کے نصیب میں نہیں تو مٹی سے سر نکالنے کی اُسے ہمّت نہ ہوتی اور اُگنے کی حماقت پر انگشت نما نہ بنتا۔ کیا کہنا ان آموں کا جن میں چند پکے ہوتے اور چند نیم رس ہیں۔ اگر میوۂ طوبیٰ پختگی اور رعنائی میں اس کے برابر ہوتا تو میرا ذمہ کہ اہلِ جنت شرابِ طہور کو بھول جاتے اور سبز بوستانِ جنّت کی طرف ملتفت نہ ہوتے۔ یہ جو پختہ اور نیم رس پھل بھیجے ہیں۔ یہ بھی آپ کی کرشمہ سازی ہے۔ جو پھل پختگی میں زرد ہیں انہوں نے بے نواؤں کو کل کے انتظار کی زحمت سے بچا لیا اور جو نیم رس ہیں اُن کا مقصد یہ ہے کہ مشتاقوں کی تسلی اور دلجوئی ہوتی رہے۔ یہ زردی گویا نہایت شوق کا مظہر ہے کہ میں خوش ہوں اور ہوتا رہوں اور نیم رسی مژدۂ وصل ہے جس کا میں آرزو مند ہوں۔

خط (۳۲)

مولوی سیّد ولایت حسین کے نام

اُمید گاہِ بیکساں۔ گرامی نامہ دو سو روپے کے تین نوٹ کے ساتھ وصول ہوا۔ اپنی ناکسی پر شرمسار اور جناب کی دلنوازی کا سپاس گزار ہوں۔

لے یہ مکتوب غالب کی روائتی، فارسی انشاء پردازی کا نمونہ ہے۔ جس میں محض عبارت آرائی اور مضمون آفرینی ملحوظ ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ رقم حضرت محمد علی خاں کی ایما سے بھیجی گئی ہے۔ لیکن جناب نے اس کا اپنے عنایت نامہ میں کوئی ذکر نہیں فرمایا ہے۔ حیران ہوں کہ اسے کیا سمجھوں۔ بہر حال میں نے یہ رقم الگ اٹھا رکھی ہے۔ جب تک خدمتِ عالی میں حاضر ہو کر قبلہ خاں صاحب کی تحریر خود نہ دیکھ لوں۔ جس سے اس عطا کی کیفیت واضح ہو میری تسلی نہ ہو گی۔ اتوار کی صبح کو حاضرِ خدمت ہوں گا۔

خط (۳۳)

مولوی سراج الدین احمد کے نام

مخلص نواز

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ دو ہفتوں میں دو خط نظر افروز ہوئے۔ مولوی نور الحسین کے خط سے گورنر بہادر کے لشکر کی نقل و حرکت کا حال معلوم ہوا۔ اور دوسرے گرامی نامہ سے اس اہم راز کا انکشاف ہوا جو دستور العمل کی روح ہے۔ آپ کا حکم بجا لا رہا ہوں اور اس کے لئے ممنونِ احسان ہوں۔ ایک عرضداشت حضرت قاضی القضاۃ کے نام بھیج رہا ہوں۔ ملاحظہ عالی کے بعد اسے ان کی خدمت میں پیش کر دیجئے اور اس کے جواب میں جو کچھ ارشاد ہو اس سے آگاہ فرمائیے۔ ہر چند میرا قصور قابلِ معافی نہیں لیکن اگر جناب مخدوم از راہ مرحمت اس معذرت نامہ کا جواب عطا فرمائیں تو اسے میرے پاس بھیج دیجئے کہ اسے میں حرزِ جاں بنائے رکھوں۔

والسلام والاکرام

خط (۳۴)

مولوی سراج الدین احمد کے نام

صاحبِ من۔ بہت دن ہو گئے کہ نامۂ گوہریں نے سوادِ نظر کو روشن نہیں کیا۔ اس سے قبل آپ نے ازراہِ بندہ نوازی جو کچھ لکھا تھا وہ میرے ضمیر پر نقش ہو چکا ہے۔ مگر دل مضطرب ہے کہ میرے معروضات کا جواب کب آئے گا اور نویدِ بہار کب ملے گی۔ حال یہ ہے کہ اس خلاف آباد میں تن تنہا محض ایک موہوم امید کے سہارے جی رہا ہوں۔ حاکموں سے انصاف کی کوئی توقع نہیں رہی۔ اگر یہی حال رہا تو بے شمار گھر اجڑ جائیں گے۔ مزید یہ کہ غمازی اور چغل خوری آج کل شہر کے عمائد کا وتیرہ بن گیا ہے۔ حکام اُن کی سنتے ہیں اور اگر کوئی دادخواہ ہو تو محکمۂ صدر کی نشان دہی کر دیتے ہیں۔ غرض ایک اندھیر مچا ہوا ہے۔

آج کہ ۲۷ رجب اور ۱۲ جنوری ہے جام جہاں نما کے ذریعہ کلکتہ میں دبا پھیلنے کی خبر ملی۔ امید کہ آپ مہینے میں کم از کم ایک بار اپنی اور احباب کی خیریت سے آگاہ فرماتے رہیں گے۔ دل اس وحشتناک خبر سے بے حد مضطرب ہے۔

خط (۳۵)

مولوی سراج الدین احمد کے نام

قبلۂ دیدہ و دل سلامت!

حیران ہوں کہ امیر جواں دولت و جواں سال اندر و استر لنگ کی مرگِ ناگہاں سے قدرت کو کیا منظور تھا۔ اس سانحۂ عظیم سے غالبِ رمیدہ بخت کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ مجھے بعض احباب کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ اس خراب آباد کے حاکم فرانس ہاکنس نے والیٔ فیروز پور کی ایما پر اُن کے حسبِ مرضی محکمۂ صدر میں رپورٹ بھیج دی ہے۔ میں نے سوچا کہ خیر کیا مضائقہ ہے۔ آخر اس رپورٹ کو استر لنگ جیسے مردِ حق پرست و حق شناس کے پاس جانا ہے لیکن تقدیر میری اس خوش فہمی پر ہنس رہی تھی۔ چنانچہ اس رپورٹ کے چارہ گر تک پہنچنے سے پہلے ہی اجل نے اُسے آلیا اور اُس کی چشم جہاں بیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ اس کے بعد خبر نہیں کہ اس بے گناہ کُش حاکم (ہاکنس) کی رپورٹ پر کیا کارروائی ہوئی۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ سیکر ٹری صاحب بہادر نے مجھے طلب فرما کر کہا کہ تیری پرورش کے لئے فرانس ہاکنس کی تجویز محکمۂ صدر سے منظور ہو چکی ہے۔ میں نے پوچھا صاحب وہ تجویز کیا ہے؟ ارشاد ہوا قاعدۂ سابق برقرار رکھا گیا ہے۔ نہ پوچھیے کہ یہ سن کر مجھ پر کیا گزری۔ دل حیران تھا کہ آخر یہ بندۂ خدا کیا کہہ رہا ہے۔ کیا میری اک عمر کی کاہش کا یہی انجام ہونا تھا؟ خدا گواہ کہ استر لنگ کی موت نے مجھے بے سروسامان کر دیا ہے۔ ساری دنیا بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک عرضداشت انگریزی میں نواب گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں ڈاک کے ذریعہ بھیج رہا ہوں جس میں سارے حالات بے کم و کاست بیان کر دیئے ہیں۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ مجھ پر جو ظلم ہوا ہے اُس کی تفصیل صاحب کے گوش گزار کریں تاکہ میری نامرادی اور خستگی کا مداوا ہو۔

بُر دلِ نازکِ دلدار گرانی مکُناد
خواہشِ ما کہ جگر گوشہ ابرامی ہست

خط (۳۶)

مولوی سراج الدین احمد کے نام

دائی من و مولائے من۔ ۷ ارمضان کو برادر ریا پیشہ و کج اندیشہ افضل بیگ اپنے مکان میں رونق افروز ہوئے اور اُسی روز شام کو مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے اور مجھے مفتخر فرمایا۔ ہاں آپ کے لئے خوش خبری یہ ہے کہ انہیں مقرب الدولہ افضل بیگ خان بہادر کا خطاب مرحمت ہوا ہے۔ خیر یہاں آتے ہی وہ کھانسی بخار میں مبتلا ہو گئے تھے۔ علاج سے قدرے افاقہ ہوا ہے۔ اب اصل ماجرا سنئے۔ افضل بیگ کی آمد سے دو دن پہلے حاکم دہلی نے وکیل میوات کو طلب کر کے اُس کے پیش کئے ہوئے کاغذ واپس کر دیے اور کہا کہ اُن کے دستخط اور مہر جعلی ہیں اور اِس امر کی سر جان مالکم بہادر نے بھی توثیق کر دی ہے۔ اِس سلسلے میں میرے ذہن میں چند اہم سوال آئے ہیں۔ پہلے یہ کہ سر جان مالکم نے فارسی خط کے جعلی ہونے کو تو باور کر لیا۔ لیکن کیا انگریزی زبان کی رپورٹ بھی ناقابل اعتبار ہے جو سرکار کی خاص زبان ہے۔ دوسرے یہ کہ فارسی خط انگریزی رپورٹ کا ناسخ کیوں کر ہو گیا اور وہ اِس قدر جلد کیسے پہنچ گیا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اِن دونوں کو ایک ساتھ رکھا جاتا۔ تیسرے یہ کہ فارسی خط مدعی علیہ کو

کیوں دے دیا گیا اور مُدعی کو اس سے بے خبر کیوں رکھا گیا۔ اور اسے یہ کیوں نہیں بتایا گیا کہ اس میں کچھ بھی رقم قابلِ وصول ہے۔ طرفہ یہ کہ مرزا افضل بیگ نے جو گورنر بہادر کے عملے میں ہیں اور جملہ امور سے واقف ہیں۔ اس خصوص میں ایک لفظ نہیں کہا کہ میری تشویش دُور ہوتی۔ مجبوراً آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ اس راز کی تہ تک پہنچنے کی ہر ممکنہ کوشش کیجیے اور مجھے حقیقتِ حال سے آگاہ فرمایئے۔ تاکہ میں بھی ضروری کارروائی کر سکوں۔ زیادہ۔ زیادہ۔

خط (۳۷)

مولوی سراج الدین احمد کے نام

اگر شکرِ الطاف بجالاتا ہوں تو خاطرِ دوست پر گراں ہوتا ہے اور باز رہتا ہوں تو مہر و وفا کے تقاضوں سے شرمساری ہوتی ہے۔ یارب پھر حق سپاس گزاری ادا ہو تو کیونکر ہو! نامۂ گرامی نے شاہدِ آرزو کے رُخ سے پردہ اٹھا دیا اور عالم عالم اسرار دیدۂ دل پر منکشف ہوئے۔ اس وقت اس کے جواب میں جو نیاز نامہ لکھ رہا ہوں۔ ممکن ہے اس کے پہنچنے سے پہلے پچھلا خط خدمتِ گرامی میں پہنچ چکا ہوگا۔ اب جو زحمت دے رہا ہوں۔ خدا کرے وہ ہمّتِ عالی پر گراں نہ گزرے اور از راہِ کرم آپ اسے گوارا فرمالیں۔ آپ کا ارشاد بالکل درست ہے۔ میں اس دادگاہ کے حال اور محکمہ کے طور طریق سے واقف ہوں۔ مگر کیا کروں کہ دل کو فریاد کے بغیر چین نہیں آتا اور جگرِ خستہ کو مرہم کے بغیر آرام نہیں ہوتا۔ بخدا اگر جارج سوئنٹن

مہربان ہوں اور حق رسی فرمائیں تو میری مراد کا بر آنا کچھ مشکل نہیں۔ کاش مجھے اتنا معلوم ہو جائے کہ اس محکمہ میں اُن کی رائے میرے موافق ہے اور میں محض اپنی بے صبری اور تنگ ظرفی کے سبب آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔ ویسے میرا کام آپ ہی کا کام ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو ایسے اہم راز حوالۂ قلم کیوں ہوتے۔ میرا جو خط پہنچے اُسے پڑھ کر مو۔۔ کو دکھانے کے بعد تلف کر دیا کیجئے۔ والسلام۔

خط (۳۹)

مولوی سراج الدین احمد کے نام

قبلۂ من۔

والا نامہ نے جان کو تازگی بخشی اور دل کو نورِ آگہی سے روشن کیا۔ معلوم ہوا کہ بےکس نہیں ہوں۔ اس خراب آباد میں میرا بھی کوئی ہے۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے اور سلامت رکھے۔ آپ کے کاروبار کی بے رونقی سے دل کو ملال ہے۔ خدا آپ کا محافظ و نگہبان ہو اور رہبر انقلاب میں آپ کو ترقی کی نئی راہوں پر پہنچائے۔ دنیا کی خوشی و ناخوشی سے بے نیاز ہو کر خلق پر نظر اور خدا سے لَو لگائے رکھئے۔ خدا گواہ کہ جب آپ کے حالات پر نظر پڑتی ہے تو دل بے چین ہو جاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ سفر کی سختیاں ختم ہوئیں اور آپ اپنے راحت کدے میں پہنچ گئے۔ آپ کے خط کے مضامین میرے دل پر نقش ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں ناکام نہ رہوں گا۔ اور میری دادرسی ضرور ہوگی۔ کیونکہ میں اپنے حق کے سوا کچھ طلب نہیں کر رہا ہوں۔ مخدومی

مرزا احمد بیگ خاں کے بارے میں آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ خدائے عظیم وجلیل کی قسم مجھے مرزا صاحب کی طرف سے محض بدگمانی نہ تھی۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ کسی نے کلکتہ میں اپنے اغراض کے تحت مرزا صاحب سے خلوت و انجمن میں میرے پیچھے میرے بارے میں کچھ باتیں کیں جنہیں مرزا صاحب نے باور کر لیا۔ اگر یوں نہ ہوتا تو یہ نہ سوچتے کہ مُدعی واقعی کوئی استحقاق رکھتا ہے اور اسداللہ حق کو چھپانا اور حق تلفی کرنا چاہتا ہے۔ بہر حال میں نے دل پر پتھر رکھ لیا اور صرف اُستاد کا یہ شعر سنانے پر ہی اکتفا کی۔

دل بر جفا نہم کہ بجز صبر چارہ نیست
اکنوں کہ دوست جانب دشمن گرفتہ است

خدا کا شکر ہے کہ سادہ دِل اور راست گفتار ہوں اور جو دل میں ہو وہی زبان سے کہتا ہوں۔ اگر کیشِ مہر و وفا میں یہ کوئی جرم ہے تو تعزیر کا سزاوار ورنہ نویدِ عفو کا خواہاں ہوں۔ والسّلام۔

خط (۴۰)

مولوی سراج الدّین کی خدمت میں

گرامی نامہ کے جواب میں تاخیر کسی بے پروائی کے سبب نہیں تھی۔ میں منتظر تھا کہ سرمایۂ تحریر بہم پہنچے اور حالات سے آگہی ہو تو کچھ عرض کروں۔ آپ کے نامۂ نامی سے سرچشمۂ فیض و عطا قبلہ و کعبہ حضرت مولوی جلیل الدّین خان کی صحت کی اطلاع ملی۔ میں کئی دن سے اس خوش خبری کا مشتاق و منتظر تھا۔ میری طرف سے

اِن کی خدمت میں خط نہ لکھنے کی معذرت اور شوق قدم بوسی پہنچا دیجیے۔ ذرا حواس ٹھکانے آجائیں تو دو ایک ہفتہ میں خدمت عالی میں عریضہ گزرانتا ہوں۔ اب میرے ستاروں کی گردش کا حال سنئے۔ بدھ ۲۸ مئی مطابق ۱۱ ذی قعدہ کو میرے مقدمہ کی رپورٹ یہاں سے محکمۂ صدر روانہ ہوئی۔ کیا بتاؤں رپورٹ کیا ہے اور مقدمہ کیا ہے۔ یہ رپورٹ نہیں بلکہ زنگیوں کی زُلف خم بہ خم، دلبستگان کا حال برہم، جہان آرزو کے خُون کا فتوے اور آبرو ریزی کا فرمان ہے۔ ستم یہ ہے کہ میں نے حاکم شہر کو اپنا مہربان سمجھا تھا۔ اب شکوہ کس مُنہ سے کروں۔ اگر میری بنائے امید استوار ہوتی تو محکمہ کے پیش دستوں کو اُس میں رخنے ڈالنے کی ہمت کیسے ہوتی اور حاکم مجھ سے رُوگرداں کیوں ہوتا۔ بہرحال اِس وقت تک تو یہ کچھ ہوا ہے۔ آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

خط (۴۱)

مولوی سراج الدّین احمد

مطاع و مخدوم و قبلۂ غالب۔

اگر دِل غم و اندوہ کا شکار نہ ہوتا تو نہ جانے کس کس طرح آپ سے شکوہ کرتا اور دامن گیر ہوتا۔ خیر ہوئی کہ میری ناکامی آپ کے کام آئی اور آپ بچ گئے ذرا دِل پر ہاتھ رکھ کر سوچیئے کہ کب سے محروم نامہ و پیام ہوں۔ دل چونکہ ابھی ایک تازہ غم سے دو چار ہوا ہے۔ شکوہ کی دو چار سطریں لکھنے کا بھی محل نہ تھا۔ لیکن اندیشہ یہ تھا کہ کہیں میرا ادا ناشناس دوست مجھے خوش جان کر اپنے تغافل کی تلافی کا خیال ہی

چھوڑ دے اور محرومیٔ جاوید میرا مقدر بن جائے۔

اس خط کی تحریر سے اصل مدعا یہ ہے کہ برادرِ مشفق نواب امین الدین احمد خاں کلکتہ کے سفر پر روانہ ہوئے اور میں اپنی گردن پر خونِ وفا لیئے یہیں ٹھہرا رہا۔

روئے سیاہ خویش ز خود ہم نہفتہ ایم

شمعِ خموشِ کلبۂ تار خودیم ما!!

میری واماندگی اور بے چارگی کا اس سے اندازہ کیجئے کہ اپنے کلیجے پر پتھر رکھ کر میں نے انہیں تنہا جانے دیا۔ عدالتِ مہر و وفا سے مجھے اس جرم پر جو بھی سزا ملے وہ کم ہے۔ اب اس کی تلافی آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس دردمند کی اس طرح دلجوئی کیجئے کہ وہ مجھے بھول جائیں اور آپ کو میری جگہ تصوّر کرنے لگیں۔ میں نے ان سے بھی کہہ دیا ہے کہ کلکتہ پہنچتے ہی آپ سے ملیں اور یہ سمجھیں کہ غالبؔ پہلے ہی سے وہاں موجود ہے۔ برادرم امین الدین خاں کی ناکامی اور ستم کشی کی داستان ایسی ہے کہ سننے والے کا دل پگھلا دے۔ زیادہ لکھوں تو بناوٹ معلوم ہوگی اور بناوٹ سے میں گریز کرتا ہوں۔

خط (۴۲)

مولوی سراج الدین احمد

رسیدن ہائے منقارِ ہما بر استخوان غالبؔ

پس از عمرے بیادم داد رسم دراہ پیکاں را

گوہریں نامۂ زینت افزائے دیدہ و دل ہوا اور انتظار کا پیچ و تاب جاتا رہا۔ آپ کی اس سادہ و پُرکار ادائے شرم ساری پر نازاں ہوں کہ عذر بدتر از گناہ پیش کیا ہے۔

عمرت دراز باد کہ این ہم غنیمت است

غالباً بھائی امین اللہ خاں کلکتہ پہنچ کر آپ سے مل چکے ہوں گے۔ ان کے نام کا ایک خط بھیج رہا ہوں یہ انہیں پہنچا دیجئے اور ان کے پتہ سے مطلع فرمایئے۔ خدا کرے کہ انہوں نے آپ سے کوئی تکلف نہ برتا ہو اور آپ کے گھر میں ہی ٹھہرے ہوں۔ میرا ان سے جو تعلق ہے اِسے محبّت و مودّت کے لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں دوئی کا شائبہ ہے اور میرے اُن کے درمیان کوئی دوئی نہیں۔ آپ اُن کے لئے جو بھی کریں گے وہ خود مجھ پر احسان ہو گا۔ مرزا احمد کے فرزندوں کے حالات معلوم ہوئے افسوس ہے کہ سارا نظام درہم برہم ہو گیا اور یہ بچے کم سنی ہی میں یتیم ہو گئے۔ خدا انہیں یک دلی کی توفیق عطا فرمائے۔ زیادہ کیا لکھوں کہ یارائے تحریر نہیں ملاقات کا آرزومند ہوں۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۸۳۴ء۔

خط (۴۳)

مولوی سراج الدین احمد کے نام

صاحب من۔

آئینہ سکندر کے اوراق دیکھ کر دیدہ و دل روشن ہو گئے۔ یہ اخبار

خبروں کی ترتیب، زبان اور اسلوب ہر لحاظ سے اعلیٰ ہے۔ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں اسے مقبولِ عام بنانے کی ہر ممکنہ کوشش کی جائے گی۔ جامِ جہاں نما کی بدولت یہاں کے لوگ اخبار بینی کے صحیح ذوق سے بے بہرہ ہیں۔ شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گزرتا ہو گا جس میں جامِ جہاں نما کو اپنی کسی پچھلی خبر کی تردید نہ کرنی پڑتی ہو۔ کسی ہفتہ لکھتا ہے کہ آغازِ سرما سے قبل والیٔ لاہور سے جنگ ہونے والی ہے اور دوسرے ہی ہفتہ تردید کر دیتا ہے کہ وہ خبر غلط تھی۔ کبھی خبر دیتا ہے کہ قلعہ آگرہ اور روضہ تاج محل کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا اور دو ہفتہ بعد اطلاع دیتا ہے کہ کونسل نے اس بیع و شریٰ کو ناجائز قرار دیا۔

بہر حال آج اتوار ۴ ستمبر کو گرامی نامہ کے ساتھ آئینۂ سکندر کا شمارہ ملا۔ مبارز الدولہ نواب حسام الدین حیدر خاں اور فخر الدولہ نواب امین الدین احمد خاں نے اسے دیکھا مگر خریداری قبول نہیں فرمائی۔ بہر حال اس سلسلے میں اعیانِ شہر کا جو بھی ردِّ عمل ہو اس سے آپ کو آگاہ کرتا رہوں گا۔ والسلام۔

خط (۴۴)

مولوی سراج الدین احمد

جنابِ عالی۔ آج جمعہ ۱۳ اپریل کو خط لکھنے کی فرصت ملی ہے جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ ۲۶ مارچ کو لارڈ ولیم کونڈش بنٹنگ بہادر تشریف لائے۔ اور رزیڈنسی کی کوٹھی میں ٹھہرے۔ دو دن بعد عملہ اور لشکر کو روانگی کا حکم ہوا اور خاص خاص لوگ شملہ روانہ ہوئے۔ سیکرٹری صاحبان شہر میں مختلف مقامات پر مقیم ہیں مولوی

محمد محسن اور مولوی سید محمد نے دو دن غریب خانہ پر قیام فرمایا اور اس کے بعد اپنی ضرورت کے مطابق رزیڈنسی کے قریب ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔ اور اس میں منتقل ہو گئے۔ شاہ دہلی کی لاٹ صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی۔ البتہ سیکرٹری صاحب بہادر رزیڈنٹ کے ساتھ بارگاہِ خسروی میں پیش ہوئے اور مختارانِ شاہی ۵ اپریل کو گورنر صاحب بہادر کے حضور میں باریاب ہوئے۔ شہر کے لوگوں کا ایک ہجوم گورنر صاحب کی خدمت میں شرفِ باریابی کا خواہاں تھا۔ ہر شخص کورنش بجا لانے اور نذر گزارنے کا آرزو مند تھا۔ سب سے پہلے نواب فیض محمد خاں بہادر والی جھجر نے اپنے فرزند اور بھائی کے ساتھ ایک سو ایک اشرفیوں کی نذر گزرانی۔ گورنر بہادر نے شرف قبول بخشا اور الماس کی انگوٹھی عطا فرمائی۔ اس کے بعد نواب اکبر علی خاں۔ نواب امین الدین خاں دوندی خاں اور دوسرے جاگیردار پیش ہوئے۔ پھر امرائے شاہی، معززین شہر، وکلا، اور دفاتر کے کارکنوں کی باری آئی۔ اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں کے داماد میر حامد علی خاں نے بھی بیس اشرفیاں نذر کیں اور انگوٹھی پائی۔ بس یہی لکھنا مقصود تھا۔

خط (۴۸)

مولوی سراج الدین احمد

اس دلنوازی کے قربان جائیے کہ کس محبت سے لکھا ہے کہ اسد اللہ دادخواہ کی دیوانگی نے رنجور وملول کر دیا ہے۔ آپ دردمندوں کی فریاد سے رنجیدہ کیوں ہوتے ہیں۔ کہ یہ تو آپ کے نیازمند دردمند کا وتیرہ ہے۔ منشی حسن علی صاحب کا خط

بلاجس پر شرمسار ہوں۔ اس کا جواب بھیج رہا ہوں تاکہ وہ مطمئن ہو جائیں اور مزید زحمت اٹھانی نہ پڑے۔ درحقیقت یہ تدبیر میری ہوس اور طمع کے سوا کچھ اور نہیں۔

میں جو عرضی انگریزی میں بھیج رہا ہوں اُسے مکتوب الیہ تک پہچانے کی دل سے کوشش کیجئے۔ اگر یہ قبول ہو جائے تو میرے سارے کام بن جائیں گے۔ ورنہ میں ہوں اور ناکامی جاوید۔ اللہ بس باقی ہوس۔

یہ مکتُوب پانچ جنوری روز شنبہ کو لکھا گیا۔ چراغ سامنے ہے اور سر خوشی کا عالم ہے ————

خط (۴۶)

مولوی سراج الدین

قبلۂ حاجات۔ دلنواز نامۂ گوہر آگیں ملا۔ دل کو فراغ اور نظر کو روشنی حاصل ہوئی۔ میرے خط نہ لکھنے کو آپ نے میرے شوق کی افسردگی پر محمول کیا ہے۔ اسے آپ نے میری موت پر محمول کیوں نہیں کیا کہ میں آپ کی اداشناسی پر خوش ہوتا اور آپ کو اہلِ دل اور دانش ور گردانتا۔ خدا گواہ کہ آپ کی محبت دل و جان کے ساتھ ہے۔ جب تک زندہ ہوں آپ کا بندہ ہوں۔ وفا میرا آئین اور محبت میرا دین ہے۔ اگر خط کا جواب دینے میں میری طرف سے کوئی تاخیر ہو تو خدارا اسے فراموشی پر محمول نہ کیجئے۔ دل رہینِ درد۔ نظر وقفِ ہنگامہ اور خاطر رنجور جدائی ہے۔ کیا بتاؤں کہ دن کس طرح گذر رہے ہیں۔ آپ نے جمنا داس اخبار نویس اور فتح اللہ خاں کو ان کے خط

پہنچا دیے اور جو کہنا تھا اُس سے زیادہ کہا۔ خدا آپ کو سلامت رکھے کہ آپ نے مجھے ایک کشاکش سے چھڑا لیا۔ اب کہ فتح اللہ خاں، جمنا داس اور شیخ علیم اللہ حالات سے واقف ہو گئے ہیں، مجھے ہر طرف کے تقاضوں سے نجات مل جائے گی۔

اس سے زیادہ غمِ دل اور شکوۂ بخت کا اظہار کیا کروں۔ آپ کے مہر و وفا کی فراوانی اور استواری کا سپاس گزار ہوں۔

خط (۴۷)

مولوی سراج الدین احمد

قبلۂ حاجات!

مدّت سے ارادہ تھا کہ موقعہ ملے تو ذرا سیرِ جہاں کو نکلوں اور اس قفس کو چھوڑ کر چند دنوں کے لئے آزادانہ صحرا کی طرف چل پڑوں۔ سوچا تھا کہ سردیوں سے پہلے افسردگی اور خستگی جاتی رہے گی اور میں اس قفس سے چند دنوں کے لئے آزاد ہو جاؤں گا۔ لیکن یہ خواہش دل ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ وائے بخت کی نارسائی۔

نومیدی ما گردشِ ایام نہ دارد!
روزیکہ سیہ شُد سحر و شام ندارد

احبابِ کلکتہ میں صرف ایک آپ کی ذات تھی جس کی دوستی اور الطاف سے دِل کو قرار ہوتا تھا۔ مگر کم و بیش ایک سال ہو رہا ہے کہ نہ تو آپ نے مجھے

یاد کیا اور نہ کوئی عذرِ فراموشی ہی فرمایا۔ ناچار آج کہ دسمبر کی ۲۸ تاریخ اور سال ۱۸۴۳ کا آخر ہے۔ یہ عریضہ بھیج رہا ہوں۔ اگر جواب مل جائے تو زہے نصیب۔ شکوۂ فراموشی کی داستان ختم کرتا ہوں۔ ۲۸، دسمبر ۱۸۴۳ء۔

خط (۴۸)

مولوی سراج الدین احمد

گرامی نامہ کا جواب دینے ہی کو تھا کہ کل پیر ۱۵ ذی الحجہ کو خبر آئی کہ مکارم اخلاق کے مجموعہ کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا۔ ایوان سروری کی شمع روشن بجھ گئی۔ آگہی کا باغ اُجڑ گیا۔ درماندوں کی آرزوؤں کا خون ہو گیا اور وہ ناخن ہی ٹوٹ گیا جس سے گرہ کشائی کی اُمید تھی۔ ہائے اندرو استرلنگ بھی کیا آدمی تھا کہ دنیا سے نیک نامی کے سوا کچھ نہ لے گیا۔ کاش اس خبر کے سننے سے پہلے ہی میرے کان بہرے ہو جاتے۔ اب میں کس سے غم خواری کی امید رکھوں اور کس کی چشمِ عنایت اب موجبِ تسکینِ جان بنے۔

کیا بتاؤں کہ فراتس ہاکنس نے میرے مقدمہ میں جو رپورٹ بھیجی وہ کتنی مایوس کن ہے۔

براہِ کرم جلد مطلع فرمایئے کہ اسٹرلنگ کے بعد دفتر کا کیا انتظام ہوا ہے اور اس کی جگہ کس کو مامور کیا گیا ہے۔ اللہ بس ماسوا ہوس۔

خط (۴۹)

مولوی سراج الدین احمد

قبلہ و کعبہ۔ آپ کے خط سے مرزا احمد بیگ کے فراق دائمی کی خبر ملی۔ میں بھی کیا سنگ دل اور کتنا سخت جان ہوں کہ دوست کی تعزیت کا خط لکھ رہا ہوں۔ اور جی رہا ہوں۔ مجھ سے کہا تھا کہ دِلّی آتا ہوں۔ مگر وعدہ فراموش راستہ بھول کر کسی اور منزل کی طرف چلا گیا۔ مانا کہ دوستوں کی خاطر اسے عزیز نہ تھی۔ لیکن کم سن بچوں کو بھی بے سایہ کر گیا۔ ہائے یاروں کی بے یاری' اور افسوس بچوں کی بے پدری۔ یوں تو ہر آدمی کو مرنا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ مرزا احمد کے مرنے کے دن نہ تھے۔ اس سے اتنا صبر بھی نہ ہو سکا کہ میں کلکتہ پہنچ کر اُس کا دیدار ہی کر لیتا۔ اتنا انتظار بھی نہ کیا کہ حامد علی جوان ہو کر کاروبار سنبھال لیتا۔ افسوس کہ بڑا لڑکا ابھی نوعمر ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری جائیداد ہوا ہو جائے اور چھوٹے بھائی اِس سے محروم ہو جائیں۔ اس موقعہ پر کسی امین ہوش مند کی ضرورت ہے جو اِسے راہِ راست پر رکھے اور یتیموں کی غم خواری کرے۔

مرا باشد از درد طفلاں خبر
کہ در طفلی از سر برفتم پدر

ان بے چاروں کی غم خواری آپ پر اور مرزا ابوالقاسم خان پر فرض عین ہے۔ اُن کی بے کسی پر نظر رکھنی چاہیے اور کسی حال میں اُن سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔

والله لا یُضِیعُ اجرا لمحسنین

خط (۵۰)

مولوی سراج الدین احمد

یہ خط اسد اللہ درد مند کی طرف سے اس یارِ خود پسند کے نام ہے جسے دوستوں کی پرسش سے دریغ ہے اور جس نے دور افتادوں کو بھلا رکھا ہے۔ ستم یہ ہے کہ اُدھر دوست اس قدر بے پروا ہے اور اِدھر ہوس کا تقاضا ہے کہ اس خط کے پہنچتے ہی اس کا جواب آجائے۔

زہے تصورِ باطل زہے خیالِ محال

گر صاحب من۔ یہ دشوار طلبی بے سبب نہیں۔ دل میں چند گرہیں ہیں۔ جن کی کشائش کے لئے بے تاب ہوں۔ پہلے خبر ملی تھی کہ نواب گورنر جنرل بہادر حسبِ دستور دادرسی کرتے ہوئے دلی پہنچیں گے اور یہاں سے گرمیاں گزارنے کے لئے پہاڑ پر چلے جائیں گے اور اس دوران میں ہر شہر کے لوگ باریاب ہو کر اُن کے حضور اپنی اپنی عرضیاں پیش کریں گے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ یہ سفر صرف الہ آباد تک ہو گا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ الہ آباد سے سیدھے کلکتہ چلے جائیں گے۔ اور بعضوں کا خیال ہے کہ الہ آباد میں دو تین مہینے قیام ہو گا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہیں۔ میں حقیقت حال جاننے کے لئے مضطرب ہوں۔ آپ وہاں موجود ہیں اور صورتِ حال سے باخبر ہیں اور یہ بھی یقین ہے کہ الہ آباد تک ضرور تشریف لائیں گے۔ ظاہر ہے کہ سفر کی تفصیلات راز میں نہیں رکھی جائیں گی۔ اگر آپ قبل از قبل مجھے ان تفصیلات سے آگاہ فرمائیں تو کرم ہو گا۔

خط (۵۱)

مولوی سراج الدین احمد

قبلۂ حاجات۔ گرامی نامہ نے جان نوازی کی لیکن اس سے مرزا احمد بیگ
مرحوم کی بہنوں کی تسکین نہ ہوئی۔ آخر حامد علی اپنی پھوپھیوں کا خیال کیوں نہیں کرتا جو اسے اپنی
جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔ اپنے خیر طلبوں کو سلام خشک بھیجنے میں اسے کیوں دریغ
ہے۔ مگر آپ اُسکی سعادت مندی کی تعریف کرتے ہیں تو مجھے بھی اسے سعادت مند سمجھنا
اور اس کی سنگ دلی اور دل آزاری کو آثارِ رشد و سعادت قرار دینا پڑیگا۔

آپ کے ارشاد کی تعمیل میں داستانِ دردِ دل قلم بند کرنا چاہوں۔ تو
مکتوب طوالت میں کلکتہ تک پہنچ جائیگا۔ لیکن ماجرا رقم پذیر نہ ہو پائے گا۔ لیکن چونکہ
میرے نالہ ہائے زار سے آپ کو دلچسپی ہے۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ ہر خط کے
ساتھ دو ایک غزلیں ضرور بھیجتا رہوں گا۔ تاکہ ارشاد کی تعمیل ہوتی رہے۔ آپ کا یہ بھی
حکم ہے کہ خط میں یہاں کی خبریں شامل ہوا کریں۔ کہتے ہیں کہ جب نادر کے حملہ کے بعد ایران
پر عام تباہی آئی تو وہ لوگ جو زمانہ کے مزاج داں اور قانون کیفر و پاداش کے ادا
شناس تھے اس تباہی کو خود اپنے اعمال کا نتیجہ کہتے تھے۔ زشتیٔ اعمال ما صورت نادر گرفت۔

یہ مثال اِس زمانہ پر بھی صادق آتی ہے۔ میری ہوس طمع اور بد اعمالی کی
بدولت نکبت و ویرانی مرحلہ بہ مرحلہ منزل بہ منزل پورے ہندوستان پر چھا گئی۔ ہر
طرف آتش بیداد بھڑک اُٹھی جس کی لپیٹ میں خاص و عام سبھی آ گئے۔ یکایک بحرِ محیط
سے ابرِ رحمت اٹھا اور ہندوستان پر برسنے لگا۔ آتش بے داد سرد ہو گئی۔ جس کا

بصورتِ دیگر بحسب حال مختار معنی یا بانِ رمز جُو کے لئے یہی کافی ہے۔ لیکن ظاہر بینوں کے لئے اِس کی تفصیل یہ ہے کہ لارڈ کونڈس ٹیبنگ بہادر نے تیسری تاریخ کو دہلی میں نزولِ اجلال فرمایا۔ جاگیر دار، مشاہرہ خوار معززینِ شہران کے دربار میں باریاب ہوئے اور عطر اور پان سے نوازے گئے۔ لیکن غالبِ غم دیدہ کی جو خود اپنے اعمال کا گشتہ ہے اِس دربار میں رسائی نہ ہوئی آبرِ رحمت سے میرا اشارہ نئے گورنر جنرل بہادر کی طرف ہے۔ والسلام۔

خط (۵۲)

مولوی سراج الدین احمد

اے بھائی سراج الدین احمد، ذرا خدا سے ڈر۔ بھلا روزِ انصاف کیا جواب دے گا جب میں تو اگریبان پکڑ کر خدا کے سامنے فریاد کروں گا کہ بارِ الٰہا یہ وہ شخص ہے جس نے پہلے مجھے اپنا فریفتہ بنایا اور جب میں نے اپنی سادگی سے اُس کی وفا پر تکیہ کیا اور دوستوں میں سے اسے اپنے لئے چُن لیا تو اُس نے مجھ سے آنکھیں پھیریں اور بے وفائی اختیار کی۔ ہائے مدتیں گذر گئیں اور یہ نہ معلوم ہو سکا کہ سراج الدین احمد کہاں ہے اور کِس حال میں ہے۔ اگر یہ جفا میری وفا کی پاداش میں ہے تو پھر بسم اللہ کہ مہر و وفا کی یہاں بھی کوئی کمی نہیں۔ جفا بقدرِ وفا کیوں نہ ہو اور اگر یہ تغافل میرے کسی جرم کی سزا ہے تو بندۂ خدا یہ تو بتایا ہوتا کہ وہ جرم کیا ہے۔ اس کے بعد جتنی چاہے سزا دے لیتا تاکہ شکوہ کی گنجائش نہ رہتی اور منہ ہی نہ کھل سکتا۔

خدا گواہ کہ زندگی ہی میں وہ عذاب جھیل رہا ہوں جو بعدِ زندگی کافر کا مقدر ہوتا ہے بلکہ یہ کہوں گا کہ مجھ پر جو گذری ہے خدا وہ کافر اور دشمن کو بھی نہ دکھائے

اب سُنو۔ نواب امین الدین احمد خاں جن کی دوستی اور رفاقت میری زندگی تھی کلکتہ چلے گئے۔ میری واماندگی کا اندازہ اس سے ہو گا کہ میں نے انہیں سفر پر جانے دیا اور خود ساتھ نہ جا سکا۔ مجھ سے انہوں نے کہا تھا کہ کلکتہ میں کسی دوست کا پتہ بتاؤ تاکہ جب میں وہاں جاؤں تو تیری طرح میری غمگساری کریں۔ میں نے کہا حاشا سوائے سراج الدین احمد کے کوئی ایسا نہیں جس کی غم خواری سے دل کو قرار ملے سو جب وہ تم سے ملیں تو اُن کی ایسی دلجوئی کرو کہ وہ رنجِ تنہائی بھول جائیں اور تمہیں میری جگہ سمجھیں۔ والسلام۔

خط (۵۳)

مولوی سراج الدین احمد

کل ۱۱، اکتوبر ہم رجمادی الاول کو ۲۹ ستمبر کا لکھا ہوا خط آئینہ سکندر کے ایک لفافے کے ساتھ ملا۔ لیکن لفافے سے صرف ایک اشتہار نکلا۔ اخبار اس میں نہ تھا، ممکن ہے اخبار رکھنا آپ بھول گئے ہوں۔ اخبار کے لئے خریدار فراہم کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہا ہوں لیکن جلد کسی کامیابی کی امید نہیں کہ آج کل حاکمِ اعلیٰ کی آمد آمد ہے اور وکلاء کچھ تو اپنے موکلین کے پاس جا چکے ہیں اور کچھ جانے والے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ میری کارروائی دادگاہ دہلی میں درہم برہم ہو گئی۔ اگر زمانہ مہلت دیتا تو

نالہ و فریاد سے زمین و آسمان سر پر اٹھا لیا لیکن زمانہ کسے مہلت دیتا ہے ۔ اگر محکمۂ سرکار
میں جیسے لوگ اپنی سادہ لوحی کے سبب معدلت آثار کہتے ہیں میری معاش سالانہ
پانچ ہزار روپے ہی ثابت ہوئی ہے تو حاکمان اعلیٰ مجھے طلب کرکے صاف کیوں نہیں
کہہ دیتے کہ بکو اس بند کر تجھے جو ملنا تھا مل چکا ۔ کیا میں دیوانہ ہوں جو اس کے بعد بھی ان
لوگوں سے جو نہ میرے خویش ہوتے ہیں نہ عزیز شکوہ کروں یا بحثا بحثی میں الجھوں ۔ منشی
نصراللہ کے توسط سے جارج سوئنٹن تک پہنچنے کا حال سوائے میرے کسی کو معلوم نہ تھا ۔
مگر قسمت ہی برگشتہ ہو جائے تو کوئی کیا کرے ۔ ذرا ستم ظریفی دیکھئے ۔ ہنری ایلاک
کی سفارش کے اثر سے کولبرک مجھ پر مہربان ہوا اور محکمۂ صدر میں ایسی رپورٹ بھیجی جس
سے اچھی تصور میں نہیں آسکتی تھی اور محکمۂ صدر سے اس کا جواب بھی سود مند دیا گیا ۔
لیکن ابھی وہ جواب راستہ ہی میں تھا کہ کولبرک کو معزول کر دیا گیا اور اس
کی جگہ ہاکنس آیا ۔ ہاکنس نے دوسری رپورٹ مرتب کرکے محکمۂ صدر کو بھیجی ۔ محکمۂ صدر میں
اسٹرلنگ سے یاوری کی امید تھی کہ اسٹرلنگ چل بسا ۔ پھر جارج سوئنٹن کو ہموار کیا
تھا کہ وہ بھی ولایت چلا گیا ۔ گویا معزول ہونا تھا تو کولبرک کو ہونا تھا ۔ مرگ ناگہاں کا
مزہ چکھنا تھا تو اسٹرلنگ کو چکھنا تھا ۔ ولایت جانا تھا تو سوئنٹن کو جانا اور ان
جانکاہ صدموں کا شکار ہونا تھا تو اسد اللہ داد خواہ ہی کو ہونا تھا ۔ اب اس کے سوا
کیا چارہ رہ گیا ہے کہ اس عدالت سے قطع نظر کرلی جائے اور منشی نصراللہ سے
وکالت نامہ لے لیا جائے اور اسے پرزے پرزے کر دیا جائے ۔

اللہ بس ماسوی ہوس ۔

خط (۵۴)

مولوی سراج الدین احمد

مولائے من! اتوار ۲ رجمادی الثانی کو دہلی پہنچا۔ اِس سفر کے دوران میں آپ کی غم خواری اور جان پروری کا شکر گزار ہوں۔ جس نے غربت کو وطن سے عزیز تر بنا دیا تھا۔ کلکتہ چھوٹنے کے غم کی تلافی کیا اور دہلی پہنچنے کی خوشی کیسی۔ مجھے دیکھ کر کون یہ کہے گا کہ یہ رہرو منزل پر پہنچ چکا ہے اور اب اپنے وطن میں آرام سے ہے۔ میری کیفیت تو ایک ایسے دردمند کی ہے جو وطن سے بچھڑ کر تازہ غم غربت کا شکار ہوا ہو۔ سراج الدین احمد، مرزا احمد بیگ خاں، مرزا ابوالقاسم خاں اور آغا محمد حسین جیسے دوستوں سے جدا ہو کر بھلا دل آسودہ کیسے رہے گا۔ طرفہ یہ کہ میری صحرا نوردی اور بیرون گردی کے ان تین برسوں میں دہلی سے رہ و رسمِ وفا ہی اُٹھ گئی۔ اب صورت یہ ہے کہ سفلوں اور کم ظرفوں کی بن آئی ہے۔ داد گاہ کا حال داد خواہوں سے زیادہ تباہ اور ان کے دن چشم بے وفایاں سے سیاہ تر ہیں۔ جب سے یہاں آیا ہوں دن رات یہی کچھ دیکھ رہا ہوں۔ نہ کسی میں مروت ہے نہ خلوص۔ حاکم خود بین و خود پسند۔ ہر طرف زوالِ دولت کے آثار۔ ایک عالم اس تباہی سے نالاں ہے لیکن اِس کے اسباب پر کسی کی نظر نہیں۔ آپ کے گرامی نامہ میں جو مجھے باندہ میں ملا تھا گورنر بہادر کی روانگی کا ذکر تھا لیکن قرائن یہ ہیں کہ فرمان ابھی جاری نہیں ہوا اور کونسل کی اکثریت اِس کے خلاف ہے۔ امید کہ آپ حقیقتِ حال سے مجھے باخبر رکھیں گے۔

خط (۵۵)

مولوی سراج الدین احمد

قبلۂ حاجات۔ بڑی مدت کے بعد آپ کا خط ملا تو فرطِ شادمانی سے میں اچھل پڑا۔ لیکن قسمت میں خوشی کہاں۔ آپ کی عزیز بہن کی رحلت کی خبر سے دل داغ داغ ہوگیا اور دنیا نظروں میں تیرہ وتار ہوگئی۔ ہائے یہ وہی مخدومہ تھیں جن کی بیماری کی خبر سُن کر آپ کلکتہ میں کس قدر پریشان و مضطرب ہوگئے تھے۔ سوچتا ہوں کہ ان کے مرنے سے آپ پر کیا قیامت نہ گزری ہوگی۔ خدا آپ کو صبر و ثبات عطا فرمائے اور خدا کرے کہ یہ آپ کی زندگی کا آخری سانحہ ہو اور اس کے بعد کوئی غم نہ دیکھنا پڑے۔ یہ کیا کہ کلکتہ سے آپ کا جی اٹھ گیا ہے۔ کلکتہ کو غنیمت جانیئے۔ اس جیسا شہر دنیا میں اور کہاں ہوگا۔ اس شہر کی خاک نشینی دوسری جگہ کی اورنگ آرائی سے بہتر ہے۔ بخدا اگر گھربار کی یہ ذمہ داریاں مرے سر نہ ہوتیں۔ تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس جنتِ ارضی میں جابستا۔ کلکتے کی خوش گوار آب و ہوا اور اس کے لطیف و شیریں نیم رس پھلوں کا کیا کہنا۔

ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد

غالبؔ آن انبۂ بنگالہ فراموش مباد

آپ کے خط سے قبلہ مرزا احمد بیگ خاں کی علالت اور سید واحد علی خاں کے علاج سے شفایابی کی کیفیت معلوم ہوئی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ ان کے نام ایک خط بھیج رہا ہوں۔ یہ انہیں پہنچا دیجیے اور میری طرف سے خیر پرسی کیجیے۔

خط (۵۶)

مولوی سراج الدین احمد

منگل ۳۱ جنوری کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ امید کہ فروغِ قبول پائے گا۔ یہ آپ کی عنایت ہے کہ مجھ سے ناچیز کو اتنا کچھ سمجھتے ہیں اور میری گمنامی کو ناموری بخشنا چاہتے ہیں۔ یہ بے طلب مرحمت اور آئینہ سکندر میں قطعہ تاریخ کا چھاپنا ویسا ہی ہے۔ جس طرح حق تعالیٰ نے اجزائے ممکنات کو جو پردۂ عدم میں تھے پیرایہ وجود بخشنا بے مانگے ہی مجھ پر نوازش فرمائی گئی ہے تو پھر ایک خواہش کی پذیرائی سے ناامید کیوں ہوں۔ اب مُدعائے نگارش سنئے۔ حکام کی بے تمیزی اور قدر ناشناسی کی بدولت فاضل بے نظیر مولوی فضل حق نے سررشتہ داری عدالت دہلی کی خدمت سے استعفا دے دیا اور اس خدمت کے ننگ سے چھوٹ گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سے ہزار درجہ بلند منصب بھی اُن کے علم و فضل کے شایانِ شان نہ تھا۔ اس استعفیٰ کے بعد نواب فیض محمد خاں نے اُن کے خادموں کے مصارف کے لئے پانچ سو روپے ماہانہ مشاہرہ مقرر کر کے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ کیا بتاؤں کہ جب مولوی فضل حق اس شہر سے رخصت ہوئے تو اہلِ شہر کے دلوں پر کیا گزر گئی۔ شاہ دہلی کے ولی عہد مرزا ابوظفر بہادر نے روانگی سے پہلے مولانا کو طلب کر کے دو شالہ دیا اور خلعتِ خاص مرحمت فرمائی اور آبدیدہ ہو کر کہا کہ آپ رخصت تو ہو رہے ہیں مگر وداع کا لفظ زبان پر نہیں آتا۔ اسے دل سے لبوں تک کھینچ کر لانے کے لئے ہزار جر ثقیل درکار ہیں۔ یہاں تک ولی عہد بہادر کا ارشاد ہے۔

اب آپ سے میری استدعا ہے کہ مولوی فضل حق کے وداع پر دلی عہد بہادر کی اندوہ ناکی اور اہل شہر کے اضطراب کا حال مناسب اور دل آویز پیرایہ میں لکھ کر آئینہ سکندر میں چھاپ دیجئے۔ یہ مجھ پر منت ہوگی۔

خط (۵۷)

مولوی سراج الدین احمد

مخلص نواز۔ مدت سے نامۂ دل نواز نے جان نوازی نہیں کی۔ یہ حقیقت آپ سے چھپی ہوئی نہیں کہ لطف و عتاب جو التفاتِ دوست کے آئینہ دار ہیں اربابِ محبت کے لئے گوارا ہو سکتے ہیں لیکن دوست کی طرف سے تغافل کسی طرح برداشت نہیں ہوتا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس عرصے میں مجھ پر کتنی قیامتیں گذر گئیں۔ میری دل دوزی کی داستان آپ ہزار سننا نہ چاہیں۔ مگر میں سنائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم

۱۶ مئی کو چراغ جلنے کے وقت سررشتہ اجنٹی دہلی کے ایک چپراسی نے ولیم فریزر بہادر کا مہری لفافہ مجھے دیا۔ ضخامت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس میں صرف ایک خط نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس میں ولیم مکناٹن صاحب کا بھی ایک خط نکلا جس میں لکھا تھا کہ قتل اور مقدمہ کے کاغذات کو نواب نے مکرر دیکھا۔ اور فرمان صادر کیا کہ ہاکنس صاحب کی تجویز منظور کی جاتی ہے اور جاگیر دار میوات کے پیش کردہ

کاغذات محکمۂ بندوبست کے سرکاری اندراجات نامکمل قرار دیے جاتے ہیں۔

سبحان اللہ!

در خاندانِ کسریٰ ایں عدل و داد باشد!

اس عجیب و غریب حکم کی وصولی کے دوسرے دن خبر ملی کہ مولوی محمد محسن خفیہ نویسی کے جرم میں ماخوذ ہیں۔ حاسدوں نے مجھے مولوی محمد محسن کا مخلص اور سجاد دوست جان کر محض مجھے پریشان کرنے کی غرض سے ہر روز میرے پاس ایک آدمی بھیجنا شروع کیا جو اُن کے بارہ میں الٹی سیدھی خبریں دل سے گھڑ کر مجھے سنا جاتا۔ دو ہفتے بعد بلیک صاحب سیکرٹری ایجنٹی دہلی کی زبانی معلوم ہوا کہ مولوی محمد محسن پر جو الزام تھا وہ ثابت نہ ہو سکا۔ لہذا انہیں صرف خدمت سے ہٹا دینے پر ہی اکتفا کیا گیا اور وطن جانے کی اجازت دیدی گئی۔ اس کے بعد میں مولانا کے لئے چشم براہ تھا۔ بارے ۲۲ جون کو ان سے ساحل دریا پر ملاقات ہوئی اور معلوم ہوا کہ انہیں رخصت خوشی سے دی گئی ہے اور دو مہینے کی پیشگی تنخواہ اور پروانہ راہداری بھی عطا ہوئے ہیں۔

بادیدۂ نم انہیں رخصت کر کے چلا آیا۔ خدا اُن کی نگہبانی کرے اور مجھے ہجرِ دوست میں صبر دے۔ والسلام۔

خط (۵۸)

مولوی سراج الدین احمد

چار مہینے سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ ہر چند آپ کی طرف سے

بے التفاتی یا بے مہری کا گمان نہیں مگر کشاکش سی کشاکش ہے کہ خط نہ لکھنے کا آخر سبب کیا ہو گا۔ میرے کسی جرم کی سزا؟ —— آپ کی طرف سے تغافل؟ —— ڈاک کی بدانتظامی —— ؟ راستہ میں خط کا کھو جانا —— ؟ اور اگر آپ کے سرکاری مشاغل خط لکھنے میں مانع ہیں تو مرزا احمد بیگ خاں کو کیا ہوا۔ اُن کے خط نہ لکھنے کو کیا سمجھوں۔ غرض دل میں طرح طرح کے وسوسے آتے ہیں، اور دل مضطرب رہتا ہے۔ بہرحال اسی پرخوش ہوں کہ مرزا صاحب نے مجھے بھلا دیا لیکن خیریت سے تو ہیں۔ کاش خدا جس نے مجھے بے کس اور آپ کو میرا غم خوار بنایا ہے۔ آپ کے دل میں مہر و مروّت ڈال دے اور آپ مجھے چند سطروں سے شاد کام فرمائیں اور میرا یہ خط پہنچے نہیں کہ اِدھر سے اس کا جواب آجائے۔

اب سنئے میری دادخواہی کی داستان۔ لارڈ کونڈس ہٹینگ بہادر میرے مقدمہ کے کاغذات اپنے ساتھ لے گئے۔ دفتر والوں کا کہنا ہے کہ کلکتے سے بھی کاغذات طلب ہوئے ہیں تاکہ سب کو دیکھنے کے بعد حکم آخر صادر کیا جائے۔ گر دل جو آئینہ دار راز ہے کشاکش کار سے ناامید ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ مجھے قتل کرنے کا حکم جاری فرمایا جائے۔ یا پھر کسی کی جاگیر سے نصف جاگیر مجھے دے دی جائے۔ اس دیارِ بے انصاف میں جو بھی ہو کم ہے۔

خط (۵۹)

مولوی سراج الدین احمد

مخدوم و معظم۔ آپ کا تغافل اگر کسی مصلحت کی بنا، پر ہے تو مجھے کچھ

کہنا نہیں ہے اور اگر یہ دیوانگی بے گانگی ہے تو بے مہری کی انتہا ہے۔ اگر خط لکھنا بار ہو تو کم از کم گورنر جنرل کی آمد کے بارے میں جو بھی خبر ہو اُسے آئینہ سکندری میں چھاپ دیجئے کہ مستقبل کی آس بندھی رہے ورنہ شمع امید بجھا چاہتی ہے۔ کیا عجب کہ جو شخص زندگی بھر شمع کے ایک پر تو سے بھی محروم رہا ہو اس کے مقدر میں روزِ روشن ہو۔

تازہ غزل بھیجنے کے بارے میں آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ مگر دل کی خوناب فشانی اور فکر کی جگر کاوی کے بغیر غزل موزوں نہیں ہوتی۔ اگر مجھے غمِ روزگار سے تھوڑی سی بھی مہلت ملتی تو پھر آپ میری فکر کے جوہر دیکھتے[1]۔ بہرحال اس افسردگی کے باوجود جس وقت بھی کوئی شعر زبان پر آ جائے اُسے سپردِ قلم کر کے خدمتِ گرامی میں بھیج دوں گا۔ خدا کرے کہ آپ اپنے تغافل پر پشیمان ہوں۔

خط (٦٠)

مولوی سراج الدین احمد

مولائے من! غمِ روزگار کی دل پر وہ سختی تھی کہ قلم کو یارائے اظہار نہیں تھا عین اسی عالم میں قاصد نے آپ کا خط پہنچایا تو میں نے جانا کہ قسمت کا آئین ناسازگاری بدل گیا ہے اور زمانہ مائل بہ کرم ہو رہا ہے۔ لیکن وائے تیرہ بختی کہ خود آپ کو بھی زمانہ سے شکایت ہے۔ اس سے میرا اضطراب کچھ اور بڑھ گیا کہ آپ کو

---

[1] ۔ اصل عبارت یہ ہے "بہ نیروئے فکر پنجہ ارباب فن برتافتی" یعنی اپنی فکر کی طاقت سے ارباب فن کا پنجہ موڑ دیتا۔

تو پہلے ہی سے خط جلد لکھنے کی عادت نہیں۔ اب وہاں کے حالات معلوم کرنے کی کیا صورت ہو گی؟

ہاں اے سادہ پُر کار و خود بیں دوست! خط پہنچنے پر بھی خط نہ ملنے کا شکوہ کرنا، کہاں کا دستور اور کس کا شیوہ ہے؟۔ حالانکہ اس سے قبل ایک خط مولوی آلِ حسن اور قاضی محمد صادق خاں کے جواب میں لکھ چکا ہوں۔ اس کا آپ کے خط میں کوئی ذکر نہیں اور پورا خط صرف میری کوتاہ قلمی کی شکایت سے بھرا پڑا ہے۔ بھائی کوتاہ قلمی کیسی۔ اُس خط کے لکھنے میں قلم جو گھسا تھا وہ آج تک فرسودہ ہے اور آپ ہیں کہ شکوے کئے جا رہے ہیں۔ خیر اب محمد حمید الدین خاں صاحب کے ذریعہ یہ خط بھیج رہا ہوں۔ انہیں آپ میری جگہ سمجھئے۔ یہ صاحب عمائد روزگار اور رؤسائے والا تبار میں سے ہیں۔ شاہانِ ہند کے دور میں اِن کے بزرگوں کی بڑی حیثیت تھی اور شیخوپورا اور اس کے مضافات پر اُن کی حکومت تھی اور اُن کی جاں فشانی اور خدمات کی بنا پر انہیں خانی اور نوابی کے خطابات عطا ہوئے تھے۔ اُن کے بڑے بھائی محمد نجف صاحب دہلی میں رہتے ہیں۔ ان سے میرے برادرانہ تعلقات ہیں۔ میری موجودہ افسردگی میں اُن کی دوستی اور رفاقت میرے لئے سامان نشاط و انبساط ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ اُن کے بھائی الہ آباد جا رہے ہیں تو جی میں آئی کہ آپ سے پیمانِ وفا تازہ کروں اور گزارش کروں کہ اس دوران میں آپ نے میرے لئے جو الطاف اٹھا رکھے ہوں وہ اُن پر مبذول ہوں۔ ان کی دلجوئی کیجئے اور اُن کے رنجِ تنہائی کا مداوا فرمایئے کہ ان کا کام میرا کام ہے۔ چند دن میں پنج آہنگ کا نسخہ خدمتِ عالی میں پہنچ جائے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ آپ اپنے

حالات سے مجھے برابر آگاہ کرتے رہیں تاکہ میری پریشانی دور ہوتی رہے۔

خط (۶۱)

مولوی سراج الدین احمد

ہر نسیمے کہ ز کوئے تو بجا نم گزرد   یادم از ولولۂ عمر سبکتاز دہد!

نامۂ مہرافزا نے دل موہ لیا اور نئی جان بخشی۔ ہرچند وہ جان بھی میں نے اس مکتوب پر نثار کر دی لیکن سپاس دلربائی ابھی باقی ہے اور تا عمر باقی رہے گا۔ آپ کا پہلا خط مجھے مل گیا تھا جس میں آپ کا حکم تھا کہ غالب خود ناشناس بزرگان پارس کے حالات بیان کرے اور کسی ایسی کتاب کی نشان دہی کرے۔ جس میں ان کے مذہب اور زبان کے بارے میں تفصیلات ہوں۔ چونکہ اس ارشاد کی تعمیل میرے بس کی بات نہ تھی اس لیے چپ ہو رہا۔

رمن کز بے خودی در وصل رنگ از بوئے نشناسم
بہر یک شیوہ نازش بازمی خواہد جوابش را!

لیکن آپ نے چونکہ دوبارہ خواہش کی ہے ناچار مہر خاموشی کو توڑ رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس خواہش کی تکمیل کار دشوار ہے اور اس سلسلے میں جستجو کرنا بے کار ہے۔ مذاہب کی تاریخ لکھنے والوں نے اپنے ادعائے آگہی کے باوجود جو کچھ لکھا ہے وہ سب ادھورا اور غلط ہے۔ بمبئی اور سورت میں جو پارسی رہتے ہیں۔ نام کے سوا ان میں اور قدیم اہل پارس میں کوئی بات مشترک نہیں۔ یہ پارسی

صاحبان قدیم اہل پارس کے رسم وراہ، معاشرت، زبان وادب غرض ہر چیز سے ناواقف محض ہیں۔ قدیم اہلِ پارس گراں مایہ منتخبانِ روزگاریں سے تھے۔ اُن کی حکمت و دانش سود مند تھی۔ مذہب خرد پسند تھا۔ ماہ و مہر و انجم کی گردش پر اُن کی نظر تھی۔ انہوں نے زمین سے بیش قیمت خزانے برآمد کئے۔ انگور سے شراب ناب بنائی اور دل کی خستگی اور رنجوری کا مداوا فراہم کیا۔ رموزِ مملکت وجہانبانی سمجھائے۔ رصد بندی کے ذریعہ تقویم مرتب کی۔ امراض کے علاج کے لئے جڑی بوٹیاں دریافت کیں۔ کہربا کی خاصیت معلوم کی۔ پرندوں اور درندوں کے شکار کے طریقے ایجاد کئے۔ غرض کوئی فن اور ہُنر ایسا نہ تھا جس میں وہ یکتا نہ تھے۔ ان کی لکھی ہوئی کتابیں سارے علوم وفنون پر محیط تھیں ان کی حکومت کے خاتمہ کے ساتھ سکندر کے ہاتھوں ان کا کتب خانہ بھی تباہ و تاراج ہو گیا۔ اور جو کتابیں تباہی سے بچ رہی تھیں وہ بھی عربوں کے دور میں خلیفہ کے حکم سے نذرِ آتش کر دی گئیں۔ اس کے بعد عربوں نے پارسی میں عربی کے الفاظ شامل کرنا شروع کئے۔ اور اس طرح ایک نئی زبان نے جنم لیا جو قدیم پارسی سے بالکل مختلف ہے۔ آج اُس قدیم زبان کا جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ اس لئے اس خصوص میں جستجو بے سود ہے۔ مولوی سید آل حسن کو میرا اسلام کہیئے اور میری یہ تحریر انہیں دکھا دیجئے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ میں اپنے ناکارہ کلام کا انتخاب اور اپنے حالات قلمبند کروں

چہ گویم از دل د جانے کہ در بساطِ من است
ستم رسیدہ یکے نا امید وار یکے

حیران ہوں کہ کیا کہوں۔ بھلا میں اس قابل کہاں کہ خود ایک ستودہ ہستی میری ستائش کرنا اور مرے ناقص کلام کو تذکرہ شعرائے ناموریں جگہ دینا چاہے۔ ایک

زبان ہے سو وہ بھی بے مایہ اور قلم ہے سو وہ بھی شکستہ اور میں ہوں کہ بچوں کی طرح مٹی کے کھلونوں کو دولت جان کر اسی پر ناز کر رہا ہوں۔ میں نے اپنے ناقص پارہ پارہ کلام سے دیوان مرتب کیا اور دوستوں کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ انہوں نے تذکروں کے لئے اس میں سے غزلوں کا انتخاب خود ہی کر لیا اور اس انتخاب میں سخن ور کا کوئی اشارہ نہ تھا۔ اسی طرح قاضی محمد صادق اختر جو خود چشم و چراغ دودمانِ سخن اور مہر منیرِ آسمانِ ہنر ہیں میرے کلام کا انتخاب کریں تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔

اگر حال سخن ور کا بیان مقصود ہو تو یہ لکھ دیں کہ زمانے کے ناکسوں اور شہر دہلی کے بے کسوں میں ایک مسلمان زادہ ہے جو کافر ماجرا اور گبر مسلمان نما ہے اور اپنی غلط نمائی کی بنا پر غالبؔ تخلص کرتا ہے اور بے ہودہ گوئی کرتا ہے۔

خرسندی غالبؔ نہ بوُد زیں ہمہ گفتن

یک بار بفرمائی کہ اے ہیچ کسِ ما

میں وہ برگشتہ بخت اور ستم رسیدہ ہوں جس کے حصے میں کوئی بھلائی نہیں آئی۔ ترک نژاد ہوں اور میرا سلسلۂ نسب افراسیاب اور پشنگ سے ملتا ہے۔ میرے بزرگ سلجوقی خاندان سے تھے اور اُن کے عہد میں فوج کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے تھے۔ جب اُن پر زوال آیا تو ایک گروہ تو ذوقِ رہزنی و غارت گری کا شکار ہوا اور دوسرے گروہ نے زراعت کا پیشہ اختیار کیا۔ پھر میرے بزرگ توران کے شہر سمرقند میں بس گئے۔ میرے جدِ اعلیٰ نے اپنے باپ سے روٹھ کر ہندوستان کا قصد کیا اور لاہور میں معین الملک کے ساتھ رہے۔ جب معین الملک کی بساطِ دولت الٹ گئی تو وہ دہلی آئے اور ذوالفقار الدولہ میر نجف خاں کے مصاحب بنے۔ میرے

والد مرزا عبداللہ بیگ خاں شاہ جہاں آباد میں پیدا ہوئے اور اس کے بعد اکبر آباد میں سکونت اختیار کی۔ میری عمر پانچ برس کی تھی کہ ان کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا اور ان کے بعد چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں بڑے ناز و نعم سے میری پرورش کرنے لگے۔ لیکن بھائی کے مرنے کے پانچ سال بعد وہ بھی چل بسے اور میں اس بھری دنیا میں تنہا رہ گیا۔ میرے چچا چار سو سواروں کی جمعیت کے ساتھ صمصام الدولہ لارڈ لیک بہادر کی طرف سے سرکشوں سے جنگ کرتے ہوتے ۱۸۰۶ء میں مارے گئے تھے۔ انہیں سرکار انگریزی سے اکبر آباد کے مضافات میں دو پرگنہ بیر حاصل جاگیر عطا ہوئی تھی۔ ان کی وفات کے بعد سرکار انگریزی کے سپہ سالار نے اس آفتاب کے خون بہا میں گداؤں کے خانۂ تاریک کو چراغ بخشا اور بے نواؤں کیلئے جاگیر کے عوض مشاہرہ مقرر کیا جس کی وجہ سے فکر معاش سے فراغ حاصل ہوا۔ آج کہ میری عمر چوالیس برس کی ہو چکی ہے۔ اس عطا پر خورسند و فارغ جی رہا ہوں۔ مجھے فیضِ سخن مبدا و فیاض سے ملا ہے اور سوادِ معنی کو میں نے خود اپنی فکر کے جوہر سے چمکایا ہے۔ میں نے آج تک کسی کی شاگردی نہیں کی اور اصلاحِ سخن کے لئے کسی کا رہینِ منت نہیں رہا۔

غالب بگوہر زدودۂ زادِ شمم زاں رو بہ صفائی دمِ تیغ است دمم

چوں رفت سپہدی زدم چنگ بہ شعر

شُد تیر شکستۂ نیاگان قلمم

خط ختم ہوا۔ اہلِ نظر کو اندازہ ہو گا کہ یہ افسانۂ پریشاں کن اس سے مختصر نہیں ہو سکتا تھا۔ بہر حال جو کچھ لکھا ہے وہ تعمیلِ ارشاد میں ہے اور اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ اگر ہے بھی تو دوست کریم سے عذر خواہ ہوں۔

خط (۶۲)

رائے چھجمل کھتری کے نام

جنابِ من - ہر چند چاہتا ہوں کہ اپنی فریاد سے دوستوں کو پریشان نہ کروں لیکن دلِ مضطرب کو کہاں لے جاؤں - کتنے نالے ہوں گے جو خوفِ رسوائی سے دل ہی دل میں گھٹ کر نہ رہ گئے ہوں گے اور دل کا کتنا خون نہ ہو گا جو آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ نہ گیا ہو گا - رنج بے دلی کا علاج معدوم اور انجام کار نامعلوم ہے - قفس سے چھوٹ کر دام میں گرفتار ہونے والے کا کیا حال ہو گا اور ناخنِ شکستہ سے گرہیں کیا کھل سکیں گی - خدا نہ کرے کہ وطن کو چھوڑ کر کوئی آلامِ غربت میں مبتلا ہو لیکن وائے اُس شخص کی قسمت جو خود وطن چھوٹنے کی آرزو رکھتا ہو اور یہ آرزو بر نہ آتی ہو - ہر چند وطن میں نہیں ہوں لیکن وطن سے قریب ہونا بھی ایک قیامت ہے - گھر والوں سے نامہ و پیام برابر جاری ہے - گھر سے جو خبریں آتی ہیں - ان سے وحشت کچھ بڑھتی ہی جاتی ہے - معلوم ہوتا ہے کہ یہ نیم جان' جسے وطن سے بچا لایا ہوں - خاک فیروزپور کی ودیعت ہو گی اور موت جس کا آرزو مند ہوں اسی سرزمین پر موجود ہو گی - نواب کی واپسی کے بارے میں جو خبریں سنی جا رہی ہیں وہ کسی طرح امید افزا نہیں - الوریوں کی نخبت - لڑائی کی تیاری اور دشمنوں کی زبونی سب افسانے معلوم ہوتے ہیں - مختصر یہ کہ کوئی یہ بتانے والا نہیں کہ نواب فیروزپور کب واپس ہوں گے - حتیٰ کہ وہ احباب بھی جو نواب کے ہمرکاب ہیں اور جن میں سے اکثر غالب کے مشفق و مُربّی ہیں کوئی اطلاع نہیں دیتے کہ درماندۂ اضطراب کی تسکین ہو - میری حالت اُس خستہ و رنجور کی سی ہے

جس کے پاؤں حریف کے مقابلے میں زخمی ہو گئے ہوں اور جس میں نہ بھاگنے کی طاقت ہوا ور نہ کھڑا ہونے کی سکت ۔ خدا کے لئے نواب کی واپسی کی ٹھیک ٹھیک تاریخ سے مطلع فرمایئے ۔

خط (۶۳)

رائے جھجمل کھتری کے نام

میرے کرم فرما ۔

دل میں مطالب بے شمار، گزارشیں بہت اور فرصت کم ہے ۔ مختصر یہ کہ ۵، ذی قعدہ جمعہ کی شام کو کرم نامہ ملا ۔ اس کے جواب میں، اس وقت صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ انشاء اللہ اسی ہفتہ حسبِ دل خواہ جواب خدمتِ عالی میں پہنچا جاتا ہے بلکہ یقین ہے کہ اس خط سے پہلے ہی موعودہ خط ڈاک کے ذریعہ آپ تک پہنچ جائے گا ۔

مقصودِ نگارش یہ ہے کہ مرزا امجد علی خاں صاحب جو اس مکتوب کے توسط سے آپ سے ملاقات کی مسرت حاصل کر رہے ہیں ۔ ایک باعزت خاندان کے فرد اور زمانے کے ستائے ہوئے آدمی ہیں ۔ ان کا سفر بھی میرے سفر کی طرح اضطراری ہے ۔ انہوں نے مجھ سے خواہش کی کہ یارانِ وطن میں سے کسی کے نام ایک تعارفی خط لکھوں ۔ میں چونکہ دوستوں کی نازک مزاجی سے واقف اور ان کی بے نیازی سے خوگر ہوں ۔ مجھے پریشانی یہ ہے کہ اگر مکتوب الیہ میری گذارش کے

باوجود اِن کی غم خواری نہ کرے تو مجھے کتنی ندامت نہ ہوگی۔ اِسی لئے آپ سے گزارش کر رہا ہوں کہ اُن کی تنہائی اور غربت کا مداوا کریں کہ خود آپ کا ایک دوست اِس وقت عالم غربت میں ہے۔ اِس خصوص میں آپ کو کیا کرنا ہوگا۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے۔

خط (۶۴)

رائے چھجمل کھتری کے نام

رائے صاحب مہربان سلامت!

جواب میں تاخیر کا سبب تغافل نہیں تھا۔ دراصل جس وقت آپ کا خط ملا ہے۔ سفر اور قیام کی درمیانی حالت میں تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اگر کام حسبِ خواہش ہو جائے تو تفصیلی خط لکھوں گا۔ قسمت نے یاوری نہیں کی۔ اور مقدمہ کی صورت جو ابتدا میں امید افزا تھی درمیانی مراحل میں کچھ اور ہو گئی۔ اچھا ہی ہے کہ ابھی اس کا انجام سامنے نہیں ہے ورنہ خدا جانے کیا دیکھنا پڑتا۔ سخن مختصر اعیان سرکار لکھنؤ گرم جوشی سے پیش آئے۔ لیکن ملازمت کے سلسلے میں جو شرطیں پیش کیں وہ میری خودداری کے منافی اور شیوۂ خاکساری کے لئے باعثِ ننگ تھیں۔ اس کی تفصیل ضبطِ تحریر میں نہیں آسکتی۔ انشاءاللہ زبانی عرض کروں گا۔ اب سنئے اس گدا طبع سلطان صورت انسان یعنی معتمد الدولہ آغا میر کی کرم گستری اور فیض رسانی کا جو شہرہ تھا۔ حقیقتِ حال بالکل اس کے برعکس نکلی۔ ابتدا میں نام و نمود کی خاطر دو ایک آدمیوں کو انہوں

نے نوازا لیکن جوں جوں اُن کی دولت بڑھتی ان کی ہوس بڑھتی گئی۔ اِس ہوس کی بدولت لکھنؤ کے سارے پرانے خاندان تباہ ہو کر در در کی ٹھوکریں کھانے لگے۔ مہاجن ساہوکار اور تاجروں نے چھُپ چھپ کر اپنا زر و مال کانپور منتقل کرنا شروع کر دیا ہے۔ غرض وہاں بے چینی سی بے چینی ہے۔ ہر شخص وہاں سے بھاگنے کی فکر میں ہے۔ میں بھی ۲۶ ذی قعدہ روز جمعہ اس ستم آباد سے نکل کر وارد کانپور پہنچا۔ دو تین دن بعد باندہ کا قصد ہے۔ وہاں چند دن آرام کر کے اگر خدا نے چاہا اور زندگی نے وفا کی تو کلکتہ روانہ ہو جاؤں گا۔ سر میں سودائے آوارگی ہے اور پائے چوبیں لیتے صحرائے آتش میں داخل ہو رہا ہوں۔ اگر مراد بر آتی ہے زہے قسمت اور اگر دامنِ مقصود ہاتھ نہیں آتا تو انجام معلوم ——

خط (۶۵)

رائے چھجمل کھتری

رائے صاحب مشفق و غمخوار سلامت۔

اپنا حال کیا لکھوں کہ گفتنی نہیں۔ داخلیات کا حال یہ ہے کہ طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہوں اور خارجیات کی کیفیت اِس قطعہ میں دیکھ لیجئے

مغلوب سطوتِ غم دِل غالب حزیں
کاندر تنش ز ضعف تواں گفت جاں نہ بود

گو شندہ زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است

مارا بدیں گیاہ ضعیف ایں گماں نہ بود

ماضی معلوم اور مستقبل غیر یقینی ہے۔ حالات کچھ سازگار بھی ہوں تو لکھوں کہ دوستوں کو خوشی ہو اور دشمن جلیں۔ میں تین خط بھیج رہا ہوں ایک مبارز الدولہ نواب حسام الدین حیدر خاں کو اور دوسرا جناب مولوی فضل حق کو پہنچا دیجئے اور تیسرا غالبؔ ناکام کے غم خانہ پر بھیج دیجئے۔ آپ کی اس عنایت کا ممنون رہوں گا۔

خط (۶۶)

رائے جھمل کھتری

مظہرِ بے التفاتی رائے صاحب مشفق و مکرم

اپنی ناکسی پر شرمسار ہوں۔ جب کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ اربابِ وطن میں میرا مشفق کون ہے تو سب سے پہلے آپ کا خیال آتا ہے۔ لیکن جب آپ سے ایک خط تک نہیں لکھا جاتا تو کسی اور زحمت کی توقع کیا رکھوں؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے دل سے آپ کی دوستی اور مہربانی کا نقش مٹا کر کسی اور کی طرف رجوع کروں۔ میں نے کلکتہ پہنچتے ہی راجہ سوہن لال صاحب کی معرفت آپ کی خدمت میں ایک خط بھیجا تھا۔ یہ کیسے فرض کروں کہ یہ خط آپ کو نہیں ملا ہو گا۔ کیونکہ اس کے ساتھ ایک اور خط جو روانہ کیا تھا اس کا جواب

بھی مجھے مکتوب الیہ سے مل چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے آپ نے طاقِ نسیاں پر رکھ دیا ہے۔ خیر اب یہ بے لفافہ مکتوب اپنے گھر کے خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ آپ سے التماس ہے کہ اپنا کچھ وقت ضائع کرکے سرکار فخر الدولہ کے سارے حالات جو اس حادثہ کے بعد رونما ہوئے ہوں۔ پوری تفصیل کے ساتھ بے کم و کاست لکھئے۔ اس کے علاوہ دربار رزیڈنسی اور دفتر کے اہل کاروں کا حال بھی لکھئے۔ نیز یہ بھی بتائیے کہ میوات کے نئے مسند نشین کے حاکم سے کیسے تعلقات ہیں۔ اگر مجھے اپنے استغاثہ کے تئے دار الخلافہ میں وکیل مقرر کرنا پڑے تو کیا آپ وکالت قبول فرمائیں گے۔؟ اس سلسلے میں جو کچھ آپ کے دل میں ہو بے تامل لکھ دیجئے۔ تکلف کی ضرورت نہیں۔ خط دو طرح سے بھیجا جا سکتا ہے۔ ایک راجہ سوہن لال کے توسط سے اور دوسرا ڈاک کے ذریعہ۔ ڈاک کے ذریعہ شملہ بازار۔ مرزا علی سوداگر کی حویلی کے پتہ پر بھیجئے۔

خط (۶۷)

رائے چھجمل کھتری

یہ نہ سمجھئے کہ میں آپ کو رسمًا خط لکھا کرتا ہوں۔ حاشا کہ دوری کی تاب نہیں۔ زیب النساء بیگم صاحب کی سفارت کا منصب مبارک ہو۔ خدا کرے کہ یہ مزید درجات ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ کاش مشاہرہ کی مقدار بھی معلوم ہو جاتی کہ میں اسی لحاظ سے شکر بجا لاتا۔ آپ نے جواہر سنگھ طو معرہ کی شادی

سے فراغت پائی۔ خوشا مسرت وزہے شادمانی۔ مبارک باد قبول فرمائیے۔ خدا اُس کی عمر و دولت میں ترقی دے اور ایسی صورت پیدا کرے کہ ہم دونوں مل کر اس کی شادی کا جشن منائیں۔ چونکہ یہ تقریب میرے غیاب میں ہو گئی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے لئے ایک خاص دعوت کا اہتمام کریں گے۔ اگر زندہ دہلی پہنچ گیا تو عشرت، میرے ذمہ رہے گی اور خرچ آپ کا ہو گا۔ بھائی یہ پتہ میں نام سے پہلے نواب اور نام کے بعد عرف کا لکھنا کیا ضرور ہے۔ سگ دنیا کو اسد اللٰہی کا شرف ہی کیا کم ہے کہ اس پر نوابی اور میرزائی کا اضافہ کیا جائے۔

آپ نے لکھا ہے کہ فلاں شخص کی روش حکیمانہ ہے اور کار دنیا سے آگہی رکھتا ہے۔ مجھے اس پر سخت تعجب اور افسوس ہوا۔ صبا رفتار گھوڑوں پر سوار ہو کر آگے آگے خلق کو دوڑانا۔ لباس فاخرہ زیب تن کر کے اکڑنا۔ مرغن غذاؤں سے پیٹ کو بھر لینا۔ شہوت سے مغلوب ہو کر رہ جانا گناہوں پر نادم نہ ہونا۔ کیا یہ حکیمانہ روش ہے۔؟ دانش ور تو ان کو کہیں گے جو مکروہات دنیا سے منہ موڑ کر اپنے خدا سے لو لگائے رہیں اور بیکسوں کی دستگیری سے دریغ نہ کریں۔ آپ اُس بندۂ ہوس کو آزاد رو اور کریم طبع کہتے ہیں۔ سو اس کی عیش کوشی کا انجام خود آپ دیکھ لیں گے کہ چند دنوں میں یہ اپنی بند ہتھیلی کو دیکھ دیکھ کر اپنے تلف شدہ مال و زر پر ماتم کرتا نظر آئے گا۔ یہ جو اس نے بعض لوگوں کو دور کر کے ایک خاص گروہ کو سینے سے لگا رکھا ہے محض حماقت اور نادانی ہے۔ حالانکہ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے ولی عہدی کے زمانے میں اُس کا ساتھ دیا اور رفاقت کا حق پوری طرح ادا کیا۔ ابتدا میں یہ ان کی طرف مائل بھی تھا مگر معاً ان کی ساری

خدمات کو بھلا کر موجودہ گروہ کے دام میں پھنس جانا اندھا پن نہیں تو اور کیا ہے۔ کیا حکیم ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیا آپ ایسے آدمی کو کرم پیشہ کہیں گے۔؟ بہر حال دل میں حکایتیں بہت ہیں۔ دعا ہے کہ دیدہ و دل کو صحیح بصیرت و دانش عطا ہو۔

خط (۶۸)

شیخ امام بخش ناسخ

حضرت سلامت۔ آپ کا کرم نامہ ملا اور آپ کی ہمدردی اور یکدلی کی خوشبو سے مشام جاں معطر ہو گیا۔ چار مہینے ہو گئے کہ دنیا سے الگ تھلگ گوشۂ تنہائی میں پڑا ہوں۔ زنداں میں نہیں ہوں لیکن زندانیوں سے بُرا حال ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ ان چند دنوں میں مجھے جن مصائب و آلام سے گزرنا پڑا ہے۔ وہ کسی کافر کے سو سال کے عذاب جہنم سے بھی بڑھ کر ہو گا۔ بقول عرفی۔

از بوئے تلخ سوخت دماغ اُمید و یاس

زہر یکہ در پیالۂ ما کرد روزگار !

اس مصیبت کا آغاز یوں ہوا کہ دو قرض خواہوں نے ضابطہ انگریزی کے تحت میرے خلاف عدالت سے ڈگری حاصل کی جس کی رو سے یا تو زرِ ڈگری ادا کرنا ہو گا یا سزائے قید اٹھانی ہو گی۔ یہ ضابطہ شاہ و گدا سب کے لئے یکساں ہے۔ معززین کے لئے صرف یہ رعایت ہے کہ عدالت کا کارندہ ان کے گھر پر نہیں جاتا۔ البتہ راستہ میں کہیں مل جائیں تو انہیں گرفتار کر لیا جا سکتا

ہے۔ چونکہ زرِ ڈگری ادا کرنے کا مقدور نہیں۔ گھر ہی میں اپنی آبرو سنبھالے پڑا ہوں۔ اسی دوران میں ایک ظالم نے رزیڈنٹ دہلی ولیم فریزر بہادر کو جو غالب مغلوب کے مربی تھے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ نہ پوچھئے کہ اس سانحہ سے مجھ پر کیا گزر گئی۔ غم مرگ پدر گویا تازہ ہو گیا اور امیدیں خاک میں مل گئیں۔ بعض لوگوں کی نشان دہی پر جو غلط نہ تھی والئ فیروز پور کا ایک ملازم پکڑا گیا۔ میرے صاحب مجسٹریٹ دہلی سے دیرینہ مراسم دوستی تھے۔ چونکہ دن کے وقت گھر سے نکلنا بوجوہ دشوار تھا۔ میں کبھی کبھی رات کے وقت اُن کی طرف جا نکلتا اور دو ایک گھڑی بیٹھ کر چلا آتا۔ اسی دوران میں تلاش و تحقیق کے نتیجہ میں والئ فیروز پور فریزر کے قتل کے مجرم قرار دیے گئے اور سرکار کے حکم سے انہیں اور چند ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ایک عرصے سے میری اور والئ فیروز پور کی کشیدگی چلی آتی تھی جس سے اہلِ شہر واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس کافرِ نعمت حاکم کُش کی گرفتاری کی تہمت میرے سر ڈال دی۔ اب دہلی کے خاص و عام میں یہی چرچا ہے کہ فتح اللہ بیگ اور اسد اللہ خاں نے کینہ پروری کی بنا پر حُکام کو بھڑکایا اور بے گنہ والئ فیروز پور کو گرفتار کروا دیا۔ لطف یہ ہے کہ فتح اللہ بیگ خاں خود والئ فیروز پور کے چچا کے لڑکے ہیں۔ مختصر یہ کہ شہر میں ہر طرف سے نشانۂ ملامت بنا ہوا ہوں۔ دل پہلے ہی فریزر کی موت سے غمگین تھا۔ اب کہ قاتل مشخص ہو چکا ہے۔ اور میں ہدفِ ملامت ہوں۔ ظالموں کو سزا دینے والے اور ستم رسیدوں کی سننے والے خدائے ذوالجلال سے دعائے صبحگاہی میں التجا کرتا ہوں کہ یہ خیرہ سر جلد اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے اور اُسے پھانسی پر لٹکایا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ میری دعا مستجاب ہے۔

چنانچہ گورنر جنرل بہادر کا مامور کردہ ایک حاکم الہ آباد سے یہاں آپہنچا ہے تاکہ حکامِ دہلی کی تحقیقات کی روشنی میں ثبوتِ جرم کے مطابق سزا کا تعین کرے۔ امید ہے کہ ایک آدھ مہینے میں یہ قصہ طے ہو جائے گا۔

یہ تھا آپ کے سوال کا جواب۔ سبحان علی خاں صاحب کے نام میرے مکتوب کے سلسلے میں آپ نے اُن کے ارشاد سے مجھے جو مطلع فرمایا ہے۔ اس کے بارے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ خان والاشان نے مجھ گمنام کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور خاکساروں کی طرف ملتفت ہونا اپنے شایانِ شان نہ سمجھا۔ اگر وہ ذرا غور فرماتے تو ان پر روشن ہو جاتا کہ میرا مقصود صرف یہ تھا کہ قطعہ بادشاہ کے ملاحظۂ عالی میں پیش ہو جاتے اور میری خاکساری اور بے نوائی کی حقیقت ان کے گوش گزار کر دی جائے۔ یہ کوئی ایسا مشکل کام نہ تھا۔ خیر خدا کا شکر ہے۔

حریفِ منتِ احبابِ نیستم غالبؔ
خوشم کہ کارِ من از سعیٔ چارہ گر گزرد

ایسا کوئی کاتب میری نظر میں نہیں ہے جو بہارِ عجم کی نقل تیار کر کے فروخت کرے۔ ہاں شہر میں اس کتاب کے دو ایک نسخوں کا مل جانا ممکن ہے۔ میں اربابِ فن سے کہوں گا کہ کوئی صحیح اور خوش خط نسخہ تلاش کر کے مجھے لا دیں۔ جیسے ہی فراہم ہو آپ کی خدمت میں روانہ کر دوں گا۔

والسلام

خط (۶۹)

شیخ امام بخش ناسخ

قبلۂ حاجات!

خط لکھنے میں تاخیر کو میری افسردگیٔ شوق پر محمول نہ فرمائیے۔ دراصل میں اس دوران میں لوگوں کے اپنے کیفرِ کردار کو پہنچنے کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ جاگیردارِ میوات کو اُس کے نائب کریم خاں کی طرح پھانسی کے تختہ پر لٹکایا گیا۔ جس نے جو بویا تھا وہی کاٹا۔ آپ کا کرم نامہ انگریزی ڈاک کے ذریعہ ملا۔ آپ یہ کیا کہتے ہیں کہ غالبؔ نے آپ کو فراموش کر دیا ہے۔ انتہائی کشاکش اور پریشانی کے عالم میں بھی دِل کبھی آپ کی یاد سے غافل نہیں رہا ہے۔ ممکن ہے ہندوستانی ڈاک کی بدانتظامی کی وجہ سے آپ کو وقت پر میرے خط نہ پہنچ سکے ہوں گے۔ اب اِس کی تلافی ہوگی اور انشاء اللہ آئندہ آپ کو شکایت نہ ہوگی۔ ہاں جاگیردارِ فیروزپور کو بھی پھانسی ہوگئی اور ان کی جاگیر بحقِ سرکار ضبط کرلی گئی۔ لیکن ابھی تک جاگیر کے آئندہ انتظام کے بارے میں تفصیلی احکام صادر نہیں ہوئے ہیں۔ یہ احکام محکمۂ صدر کلکتہ سے جاری ہوں گے۔ مجھے اِس جاگیر سے سرکارِ انگریزی کے حکم سے کچھ رقم مِلا کرتی تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکام اس خصوص میں کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ اب تک تو یہ تھا کہ جاگیردارِ فیروزپور مجھے میرے استحقاق سے کم رقم ادا کرتا تھا۔ اب اگر سرکار انگریزی سے بھی اتنی ہی رقم کا مِلنا قرار پاتا ہے تو میں اِس پر قانع نہ ہوں گا۔ بہرحال اِس معاملے میں کئی پیچیدگیاں باقی ہیں۔ بقیہ حالات پھر عرض کروں گا۔ والسلام۔

خط (۷۰)

مولوی محمد علی خاں صدرامین باندا بوندیل کھنڈ

قبلۂ خدا پرستان وکعبۂ حق جویان سلامت!

گزارشِ مراسمِ نیاز کو تقریبِ کامیابی اور حصولِ سعادت کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ حاملِ مکتوب گواہ ہے کہ میں یہ خط کس حالت میں لکھ رہا ہوں۔ جمعرات کو موڑہ پہنچا اور اتوار تک وہیں ٹھیرا رہا۔ پیر کی صبح کو موڑہ سے چلا اور رات ایک گاؤں میں گزاری۔ منگل کو چلہ تارا پہنچا۔ اگر زندگی باقی رہی تو کل صبح فتح پور روانہ ہو جاؤں گا۔ ——— زیادہ حدِ ادب

خط (۷۱)

مولوی محمد علی خاں

قبلۂ جان و دل سلامت!

تسلیم نیاز۔ ابھی سفر کی گرانی باقی ہے۔ ضعف اگر باقی ہے تو کوئی تردد نہیں کہ یہ وطن ہی سے میرا رفیقِ سفر ہے اور جزوِ زندگی بنا ہوا ہے۔ پیر کو ایک بیل گاڑی جسے یہاں لڑھکتے ہیں سامان لے جانے کے لئے کرایہ پر لی۔ مگر یہ مجھ سے بھی زیادہ ضعیف نکلی۔ آہستہ خرام بلکہ مخرام کی سی کیفیت ہے۔ موڑہ سے ۱۲ میل کا فاصلہ بھی اُس سے دن بھر میں طے نہ ہو سکا۔ ناچار راستہ کے ایک گاؤں

میں رات گزارنی پڑی۔ منگل کو آخرِ شب اُس گاؤں سے روانہ ہوا اور دو پہر دن تک چلہ تارا کی کاروان سرائے پر پہنچ گیا لیکن وہ سُست رفتار گاڑی شام ہی کو پہنچ پائی۔ اسی دوران جھٹپٹے میں کہ چراغ ابھی روشن نہیں ہوئے تھے۔ وہ مکتوب لکھا تھا۔ میرزا مغل صاحب نے فرمایا تھا کہ آپ کا خط تھانہ دار چلہ تارا کے حوالے کر دوں تو آپ تک پہنچ جائیگا۔ میں کاروان سرائے میں سامان کی گاڑی کے آنے کے انتظار میں میٹھا تھا کہ اتفاقاً تھانہ دار صاحب وہاں آنکلے اور ٹہلنے لگے۔ پہلے تو مجھے تامّل ہوا کہ ایک اجنبی آدمی سے کیوں کر کہوں کہ یہ خط مولوی صاحب تک پہنچانے کا انتظام کر دے۔ چونکہ سوائے اِس کے کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ میں نے اُن سے خط کا ذکر کیا۔ جب انہوں نے آپ کا نام سنا تو بڑے احترام سے خط لے لیا۔ چنانچہ اندھیرے میں جو چند سطریں سپردِ قلم کی تھیں وہ میں نے ان کے حوالہ کر دیں۔ اب جو خط لکھ رہا ہوں ممکن ہے وہ کلکتہ پہنچنے تک آپ کو مل جائے۔ میں نے تنگ آکر یہاں سے کشتی کرایہ پر لے لی ہے اور بسم اللہ مجریہا و مرسہا پڑھ کر دریائے جمنا کے راستہ الہ آباد روانہ ہو رہا ہوں۔ وہاں سے بنارس جانے کا ارادہ ہے۔ جہاں چند روز توقف کرنے کے بعد اسبابِ سفر درست کر کے بنگال روانہ ہو جاؤں گا اور مرشد آباد پہنچ کر ہی دم لوں گا۔ اِس دوران میں دریائی سفر کے بارے میں ضروری معلومات بھی بہم ہو جائیں گی۔ کشتی بانوں کا کہنا ہے کہ الہ آباد تک تین دن کا راستہ ہے۔ بدھ کی دوپہر کو کشتی میں سوار ہوں گا اور دل کو ناخدا کی طرف نہیں خدا کی طرف رجوع کروں گا۔

زیادہ حدِ ادب۔

خط (۷۲)

مولوی محمد علی خاں

قبلہ و کعبۂ دو جہاں!

تسلیم و نیاز۔

خدا کا شکر ہے کہ فیضانِ تجلّی کا ابھی میری خاک تیرہ سے تعلق باقی ہے۔ گرامی نامہ نے عزت بخشی۔ بہرِ بُن مو سے شکرِ عنایت بجا لا رہا ہوں۔ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق ۹ تاریخ اور بعض کے بموجب ۱۰ تاریخ کو جمعہ کے دن یہاں سے چلنے کا ارادہ ہے۔ کشتی کے خدا ناشناس ناخدا کلکتہ جانے کے لئے سو روپے سے کم پر تیار نہ تھے اور پٹنہ تک کے لئے ۲۰ روپے سے زائد کرایہ طلب کر رہے تھے۔ مجبوراً گھوڑے پر صحرا پیمائی کر رہا ہوں لیکن کشتی کے سفر کا خیال ابھی دل سے گیا نہیں ہے۔ پٹنہ پہنچ کر کشتی کرایہ پر لینے کی پھر کوشش کروں گا۔ دل و زبان آپ کے الطاف و کرم کی سپاس گزاری کے لئے وقف ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے کہ مجھ سے بے کس و بے نوا کو بغیر کسی سابقہ تعارف کے لطف و کرم سے نواز رہے ہیں۔ زیادہ حدِ ادب۔

خط (۷۳)

مولوی محمد علی خاں

قبلہ جناب مولوی صاحب!

لے معلوم ہوتا ہے رویتِ ہلال میں اختلاف ہو گیا تھا۔

کئی دن سے دِل سوزِ فراق میں جل رہا ہے اور جبیں آستانِ عالی پر سجدہ ریز ہونے کے لئے بے تاب ہے۔ مگر آتشِ شوق کو بجھانے کی کوئی سبیل نہیں کہ راستہ میں سات دریا حائل ہیں۔ گرامی نامہ بنارس میں نظر نواز ہوا تھا۔ جس کا جواب اُسی وقت لکھ کر خشکی کے راستہ عظیم آباد کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ بہرحال خدائے توانا کے فضل و کرم اور بزرگوں کی دعا کے سہارے ہزار زحمتوں سے گزر کر ۱۴ شعبان کی صبح کو کلکتہ پہنچا۔ خدائے غریب نواز کا احسان ہے کہ اُس نے یہاں میرے لئے ہر طرح کی سہولت اور آسائش مہیا کر دی اور کسی زحمتِ جستجو کے بغیر ایک اچھا مکان جس میں میٹھے پانی کا کنواں بھی ہے دس روپے ماہانہ کرایہ پر مل گیا ہے۔ سفر کی تکان دور ہونے کے بعد کشتی کے ذریعہ نواب علی اکبر خاں طبا طبائی سے ملنے ہوگلی بندر گیا۔ یہ ملاقات میری خوش بختی کی نشانی ہے اور مجھے خود اپنے آپ پر رشک ہو رہا ہے۔ خدا گواہ کہ اُن کے جیسا گراں مایہ اور برگزیدہ صاحبِ دل اس دیار میں اور کوئی نہیں۔ حیران ہوں کہ یہ کس گنجِ گراں مایہ کا موتی ہے۔ چونکہ پہلی ملاقات تھی خیریت کر کے واپس چلا آیا۔ افسوس کہ آج کل نواب موصوف اور حکّام ہوگلی بندر کے مابین امام باڑہ کے وقف کی زمین کے بارہ میں کوئی تنازعہ چل رہا ہے جس کی وجہ سے وہ فکرمند ہیں

ہمہ را ماتمئ حسرتِ دنیا دیدم !
چوں بہ عشرت کدۂ گردِ مسلمان رفتم

بخت یاور او رزمانہ مطیع و فرمانبردار رہے۔

خط (۴۷)

مولوی محمد علی خاں

قبلہ گاہ و پناہ بیکساں!

آب و ہوائے بنگال مجھے راس آئی اور میں اس دیار میں وطن سے زیادہ آسودہ ہوں۔ آتے ہی سائمن فریزر اسسٹنٹ سیکرٹری سے ملاقات ہوئی۔ بڑی خوش خلقی سے پیش آئے۔ معانقہ کیا اور عطر و پان پیش کیا۔ اس طرزِ ملاقات سے طبیعت بہت خوش ہوئی اور دل کو اطمینان ہوا۔ نواب گورنر جنرل بہادر کے نام عرضداشت قاعدہ کے مطابق سیکرٹری صاحب کو پیش کی۔ انہوں نے اسی وقت اسے پاٹن صاحب کے حوالے کیا تاکہ انگریزی میں اس کا ترجمہ کر دیں۔ ایک اور امیر اینڈریو اسٹرلنگ نامی ہیں جن کا کونسل میں بہت اعلیٰ مقام ہے۔ یہ علم و آگہی کی دولت سے مالا مال ہیں اور بہت اعلیٰ ذوقِ سخن بھی رکھتے ہیں۔ میں نے اُن کی مدح میں پچپن اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا جس کے آخر میں اپنے حالتِ زار کی کیفیت بھی بیان کر دی۔ یہ قصیدہ انہیں پسند آگیا اور انہیں میری خاکساری کا اندازہ ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے میری دلجوئی فرمائی اور دستگیری کا وعدہ فرمایا۔ اسٹرلنگ بہادر چیف سیکرٹری کے عہدہ پر فائز ہیں اور کونسل کے رکن بھی ہیں۔ سائمن فریزر اس حاکم خزانہ کے پیش کار اور ماتحت ہیں۔ کونسل کے نام جتنی عرضداشتیں وصول ہوتی ہیں۔ فریزر صاحب ان کی فہرست اور داد خواہوں کے نام اسٹرلنگ صاحب کے ملاحظہ میں پیش کرتے ہیں اور وہ ہر ایک کو طلب کر کے حالات و واقعات

معلوم کرنے کے بعد طے کرتے ہیں کہ کون سے مقدمات کونسل میں پیش ہوں گے اور بقیہ عرضیاں واپس کر دیتے ہیں۔ میری کارروائی کونسل میں پیش ہونے کے لئے قبول کر لی گئی ہے۔ اب دیکھئے آگے کیا گزرتی ہے۔ زیادہ حد ادب۔

خط (۷۵)

مولوی محمد علی خاں

از جگر تشنہ بہ دریا درود	وز تن بے جاں بہ مسیحا درود
از شب دیجور بہ نیر سلام	وز لب مخمور بہ صہبا پیام
از دل افگار بہ مرہم سپاس	وز من رہ جو بہ خضر التماس

دو مہینے اور دس دن ہو گئے کہ والانامہ سرمۂ چشم نگراں نہ ہوا۔ یکم ذی الحج کو ایک عریضہ خدمت گرامی میں روانہ کیا تھا۔ اور دوسرا ۱۰ ذی الحج کو مولوی سید ولایت حسین کے خط کے ساتھ ملفوف کر کے بھیجا تھا۔ یہ کیسے سمجھ لیتا کہ راستہ میں تلف ہو گیا ہو گا۔ اب مولوی سید ولایت حسین سے معلوم ہوا کہ خود آپ میرے خط کے منتظر ہیں۔ ہر چند اس اطلاع سے میرے درد کا مداوا نہ ہو سکا۔ لیکن مطمئن ہوں کہ آپ کو میرا خیال ہے۔ پچھلے خطوں میں اپنی کارروائی کے بارہ میں مختصراً لکھ چکا ہوں۔ میری عرضداشت کونسل میں پیش ہوئی۔ اس پر حکم ہوا کہ پہلے رزیڈنٹ بہادر دہلی کی خدمت میں فریاد پیش کرو۔ میں نے عرض کی اب دہلی جانے کی سکت نہیں ہے۔ ارشاد ہوا خود یہیں ٹھہرے رہو اور دہلی میں وکیل کے ذریعہ کارروائی کرو۔

میں نے دہلی کے ایک کرم فرما سے اعانت چاہی اور اُس نے اپنی مہربانی سے وکالت قبول کر لی۔ میں نے وکالت نامہ دستخط کر کے ضروری کاغذات کے ساتھ اس کو بھیج دیا۔ یہ دوست مجھ پر خود مجھ سے زیادہ مہربان اور مری کارسازی میں مجھ سے بڑھ کر کوشاں ہے۔ اب دیکھیئے خدا کیا کرتا ہے۔ اللہ بس ماسوی ہوس۔

خط (۷۶)

مولوی محمد علی خاں

قبلہ گاہا: تسلیم نیاز۔

والا نامہ کیا ملا گویا مجھے قلمرو شادمانی کی بادشاہی مل گئی۔ بارے دل سے سارے اندیشے دُھل گئے اور طبیعت کو اطمینان نصیب ہوا۔ اس وقت دل میں ذوقِ حضوری موج زن ہے۔ اس لئے آداب و القاب کی گنجائش نہیں چاہتا ہوں کہ تحریر کو تقریر بنا دوں اس لئے تقدیم و تاخیر کی پروا کئے بغیر وادیٔ خیال مستانہ طے کر رہا ہوں۔ مقصود یہ ہے کہ کوئی بھی کیفیت آپ سے چھپی نہ رہے۔ اب سے دو ہفتے قبل مولوی سید ولایت حسین صاحب غریب خانہ پر تشریف لائے تھے۔ وہ اُسی وقت سفر پر روانہ ہو رہے تھے۔ اس لئے میں نے وہیں انہیں خدا حافظ کہا۔ ان ہی دنوں دہلی سے خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ میرے کاغذات پہنچ گئے اور میری جانب سے وکالت نامہ بھی داخل کر دیا گیا لیکن ابھی کارروائی شروع نہیں ہوئی تھی کہ روشن الدولہ سرا ڈورڈ کولبرگ بہادر حاکمِ دہلیؔ دورہ پر چلے گئے۔ اب

ؔ۔ اصل عبارت میں فرمانروائے دہلی ہے۔

اُن کی واپسی کا انتظار ہے۔ یہ غیر متوقع تاخیر الگ ہے۔

یہاں کا حال یہ ہے کہ ولیم بیلی صاحب جو کونسل کے رکنِ اعظم ہیں اور اس کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ برما تشریف لے گئے ہیں۔ لارڈ ولیم کونڈس بنٹنگ بہادر جو آج کل گورنری پر فائز ہیں شکار کے لئے مالدہ گئے ہیں جو کلکتہ کے مشرق میں ایک شکارگاہ ہے۔ مولوی محمد عبدالکریم میر منشی دفتر فارسی آٹھ ... کی رخصت پر دریا کے راستہ لکھنؤ روانہ ہو چکے ہیں اور غالباً اس وقت تک عظیم آباد پہنچ چکے ہوں گے۔

میرے یہاں آنے کے بعد اس شہر کے سخن وران نکتہ رس ایک محفل سخن آراستہ کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو یہ محفل کمپنی کے سرکاری مدرسہ میں منعقد ہوتی ہے جس میں سخن گو فارسی اور اردو کی غزلیں سنایا کرتے ہیں۔ اس محفل میں ایک دن ایک مردِ گراں مایہ نے بھی جو یہاں ہرات سے آئے ہیں شرکت کی اور فقیر کے کلام کو بہت سراہا اور دوسرے نادرہ گویوں کے اشعار پر تبسم زیرِ لب فرمایا۔ اس سے ان سخن وروں کو حسد ہوا اور رخاصانِ انجمن اور فرزانگانِ فن نے میرے دو شعروں پر غلط اعتراضات کئے اور شہر میں ان کی خوب تشہیر کی۔ قبل اس کے کہ میں اس کا جواب دیتا مخدومی نواب علی اکبر خاں اور مولوی محمد حسن نے ان اعتراضات کا مسکت جواب دیا اور معترض چُپ ہو کر بیٹھ رہے۔ میں نے ان بزرگوں کے ارشاد کی تعمیل میں ایک مثنوی لکھی جس میں اظہارِ عجز وانکسار کے بعد اعتراضات کے جوابات نظم کر دیے گئے۔ انشاء اللہ اس کے بعد کے خط میں یہ مثنوی ملاحظہ گرامی کے لئے بھیجوں گا۔

خط (۷۷)

مولوی محمد علی خاں (باندہ)

حضرت ولی نعمت قبلہ گاہی۔

آپ کے لطف و کرم اور قدر افزائی کا شکریہ کس طرح بجا لاؤں۔ پرسوں منشی عاشق علی خاں بہادر نے مجھے ایک لفافہ بھیجا۔ کھول کر دیکھا تو آپ کی تحریر نظر افروز ہوئی اور دیدہ و دل منور ہوگئے۔ معلوم ہوا کہ آپ نے خان ممدوح کو میرے اشعار بھیجے ہیں۔ منشی صاحب قبلہ نے خاکسار کو لکھا کہ کوئی وقت مقرر کرکے انہیں اطلاع دوں تاکہ وہ غریب خانہ پر تشریف لاکر مجھے سربلندی بخشیں۔ میں نے اسی وقت جواب لکھ کر بھیج دیا اور دوسرے روز خود اُن کے درِ دولت پر حاضر ہو کر قدمبوسی کا شرف حاصل کیا۔ خاں صاحب وحدتِ وجود کے عارفوں میں سے ہیں۔ میں پہلے ہی شمع و چراغ انجمن مولوی سید ولایت حسین کے شیوۂ اخلاق کا گرویدہ اور سپہر معنی آشنائی نواب علی اکبر خاں کا ممنونِ احسان تھا۔ اب خانصاحب ممدوح کی نیازمندی سے میری آبرو اور بڑھ گئی۔

اس آوارگی میں آپ کے قدموں سے دوری کا غم ہے۔ اس درد کا مداوا کیسے ہوگا۔ میں تو میر اکبر علی کی سپاس گزاری ہی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ جنہوں نے آپ کے آستانہ عالی تک مجھے پہنچایا۔ چہ جائیکہ آپ کی مدح میں لب کشائی کروں۔

خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست

یہ عریضہ ۶ شعبان کو لکھ رہا ہوں اور اسی روز میر صفات علی
خاں کے توسط سے لالہ کانجی مل کو بھیج رہا ہوں تاکہ وہ اسے اپنے خط کے
سا تھ باندھ بھیج دیں۔

خط (۴۸)

میجر جان کوب[1] بہادر

اے نشان ہائے خرد در تو ہویدا تر از آں
کہ سرد داز لب و آب از گہر ناب زہیر

ہم ز روئے تو نمودار توانائی رائے !
ہم ز خوئے تو پدیدار دِل آرائی مہر

کرم نامہ پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ آپ نے لکھا ہے کہ دیوانِ حافظ جسے
آپ نے بڑی محنت سے مرتب کیا اور اِس شاہد روحانی کو آراستہ کیا ہے۔ غالب
جس کو پتھر اور موتی کی تمیز نہیں اس کا دیباچہ تحریر کرے اور اس دیباچہ میں آپ کے
اپنے ارشادات اور دوسری وہ تحریریں بھی شامل کرے جن کے اقتباسات
آپ نے بھیجے ہیں۔

مخلص نواز۔ جن تحریروں کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ میرے سامنے
نہیں ہیں اور جو اقتباسات میرے سامنے ہیں وہ میری سمجھ سے باہر ہیں۔ بھلا بتلایئے

---

[1] ۔ میجر جان جیکب تقریظ میں غالبؔ نے جان جا کوب نظم کیا ہے۔

میں انہیں اپنی تحریر میں کس طرح شامل کر سکتا ہوں۔ لیکن چونکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل ضروری ہے۔ میں دیباچہ کی بجائے تقریظ لکھ رہا ہوں۔ عربی میں تقریظ اس عبارت کو کہتے ہیں جو کتاب کے آخر میں چھاپی جائے۔ پس یہ تقریظ ہے دیباچہ نہیں۔ آپ خود دیباچہ لکھ رہے ہیں۔ اس میں دوسری تحریروں کے ساتھ اس تقریظ کا ذکر کر دیجئے۔

امید کہ آپ مجھے اپنا وفادار دوست سمجھیں گے اور اپنے اشعار مجھے بھیج کر مہر افزائی فرمائیں گے۔

دعا ہے کہ آپ کی بصیرت اور اقبال میں اور ترقی ہو۔

خط (۹۷)

میجر جان جیکب

امیدگاہ مخلصان کی خدمت میں بندۂ محبت و وفا کی طرف سے ایک بار کی یاد آوری اور بندہ پروری کے جواب میں صد ہزار شکر و سپاس۔

نامۂ دل نواز ایک ڈاک کے ذریعہ اور دوسرا طالع یار خاں صاحب کے توسط سے وصول ہوا۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ آپ گوالیار میں نشیمن راحت کی بناء ڈال رہے ہیں۔ آپ نے مجھ سے اس کی تاریخ لکھنے کی خواہش کی ہے۔ اس محبت کی قسم کھا کر کہتا ہوں جو میرا دین و ایمان ہے کہ مجھے نہ فن تاریخ گوئی سے کوئی دلچسپی اور نہ معنی کو چھوڑ کر محض لفظی صنعت گری میرا شیوہ ہے۔ لیکن چونکہ

آپ کی خاطرِ عالی مجھے عزیز ہے۔ نکرد قلم کی کیا مجال کہ اس حکم سے سرتابی کریں۔
سات شعر کا قطعۂ تاریخ درج کر رہا ہوں۔ امید کہ قبول فرمایا جائے گا۔

اشعار

خط (۸۰)

جانِ حبیب

حق نہ آنست کہ از رفتن باطل برود
نہ رود مہر تو از دل خود اگر دل برود

آپ کا محبت نامہ میرے لئے مژدۂ زندگی اور نوید مسرت لایا۔
آپ نے میرے خط نہ لکھنے کا گلہ کیا ہے۔ یہ کیسے کہوں کہ گلہ ناروا ہے۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ اگر آپ نے خط لکھا ہوتا اور میں نے اس کا جواب نہ دیا ہوتا تو آپ کا شکوہ یقیناً بجا تھا۔ وفاکیشی، حق جوئی اور حق گوئی میرا آئین ہے۔ آپ جیسے ناموروں کو کسی گمنام کی یادآوری کی زحمت دینا میرا شیوہ نہیں۔ البتہ دوست کے خط کا جواب نہ دینے کو آئینِ وفا کا جرم سمجھتا ہوں۔ بہر حال اس پر بھی خوش ہوں کہ آپ نے خود میری دلجوئی کی زحمت گوارا نہیں فرمائی اور الٹا مجھ ہی پر منت رکھ رہے ہیں۔
آپ کے ارشاد کی تعمیل میں کنویں کی تعمیر پر قطعہ تاریخ بھیج رہا ہوں۔

لے بس قطعہ میں "آسمانی پایہ کاخِ دلنشین" کے مصرعے سے تاریخ نکالی ہے۔

مجھے احساس ہے کہ مادۂ تاریخ[1] کسی تعریف کے قابل نہیں۔
امید کہ آپ میرے جرم ناکردہ سے درگذر فرمائیں گے۔

خط (۸)

جانِ جیکب

ایں نامہ کہ راحت دلِ ریش آورد
سرمایۂ آبروے درویش آورد

در ہر بُنِ مو دمید جانے یعنی
سرمایۂ نثارِ خویش باخویش آورد

نامۂ جاں نواز گویا طلوعِ صبح، خرامِ نسیم اور شگفتگیٔ گُل ہے۔ اظہار سپاس پر قلم کو ناز کیوں نہ ہو! جس طرح پیاسی مٹی اور رگِ تاک پر ابرِ بہار کی منت ہوتی ہے۔ اسی طرح میر نواب کا مجھ پر احسان ہے کہ انہوں نے آپ کا خط پہنچایا اور دل وجان کو تازگی بخشی۔

تعمیلِ ارشاد میں اپنے افکارِ پریشان کو دیوان کی صورت دے کر آپ کی خدمت میں بھیجنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی مشتِ خس چمنستان کی نذر کرے۔ اگر تعمیل کرتا ہوں تو اپنے کلام کی بے مائگی پر شرمندگی ہوتی ہے اور نہ کروں تو تقاضائے

---

[1] خورشید زمین گشت و دریں زمزمہ لب بست   ویں تعمیہ را خوب ترا زگنج گہر یافت
پورا قطعہ سات اشعار پر مشتمل ہے۔

مہر سے ندامت۔ مختصر یہ کہ میرا کلام پارہ پارہ اور منتشر ہے۔ کسی ایسے کاتب کی تلاش میں ہوں جو اسے مربوط اور صحیح نقل کر کے مجھے لا دے۔ جیسے ہی یہ مرتب ہو میر نواب صاحب کے ہاتھ یا ڈاک کے ذریعہ خدمت گرامی میں پہنچ جائیگا۔

خط (۸۲)

جانِ حبیب

آپ کے نامۂ اندوہ ربا کا شکر قیامت تک بھی بجا لاتا رہوں تو اس کا حق پوری طرح ادا نہ ہو گا۔ ایک ناکس کی خطاؤں سے درگذر کر کے اس کی دلجوئی کرنا اور اس کی کم خدمتی پر اسے شرمسار نہ ہونے دینا ایسی نوازش ہے جسے دل ہی جانتا ہے۔ سید الاخبار کے بارہ میں آپ نے جو لکھا ہے وہ منت مزید ہے۔ مطبع سید الاخبار کے مالک جو میرے عزیز دوست ہیں میرا کلام چھاپ رہے ہیں غالباً دیوان اردو ایک مہینے کے اندر اندر چھپ کر نظرِ عالی سے گزرے گا۔ اسی طرح پنج آہنگ اور دیوان فارسی بھی زیر ترتیب ہیں۔ لیکن ان کے چھپنے کا انحصار خریداروں کی درخواست پر ہے۔ سید الاخبار ہر ہفتہ آپ کی خدمت میں پہنچتا رہے گا۔ مطبع والوں نے میری آپ سے نیازمندی کی بنا پر آپ کا نام نامی سرِ فہرست خریداران رکھا ہے۔ معلوم ہوا کہ شہزادہ کی ولادت پر میرا قطعۂ تہنیت جسے میں نے بارگاہِ خسروی میں گزارنا ہے زبدۃ الاخبار میں آپ کی نظر سے گذرا۔ آپ کی ستائش کا شکر گزار ہوں۔

خدا آپ کو سلامت رکھے کہ آپ سخن رس اور سخنداں ہیں۔ والسلام والاکرام۔

خط (۸۳)

منشی محمد حسن

امید گاہا!

رات کا وقت ہے۔ چراغ سامنے ہے جس کی روشنی حجرہ سے ایوان تک نہیں پہنچ پا رہی ہے اور میں افسردگی کے عالم میں یہ نیاز نامہ لکھ رہا ہوں۔ قسمت ایسی بھی نارسا نہیں کہ اگر لطف و کرم کا اہل نہیں تو نگاہِ رحم سے بھی محروم رہوں۔ اچھوں کو بُروں پر اور خردمندوں کو نافہموں پر رحم آ ہی جاتا ہے۔ اسی لئے گذارش حال کی جسارت کر رہا ہوں۔

اس سے قبل ایک نیاز نامہ سبحان علی خاں صاحب کے نام اور ایک عرضداشت بادشاہ کے مدحیہ قصیدہ کے ساتھ راجہ صاحب رام کے وکیل لکھنو کے پاس بھیج چکا ہوں تاکہ اسے خاں صاحب والاشان اور وزیر اعظم کے توسط سے بارگاہِ خسروی میں پیش کیا جائے۔ اس کو پورے چالیس دن ہوگئے مگر آج تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس کا حشر کیا ہوا۔ معاً مجھے اس گدائے نابینا کی طرح جو لاٹھی کے سہارے کے بغیر دو قدم بھی نہ چل سکتا ہو آپ کا خیال آیا۔ میں نے اسی وقت راجہ صاحب رام کو خط لکھا کہ اپنے وکیل کو ہدایت کر دیجئے کہ قصیدہ اور عرضداشت آپ کے سپرد کر دیں۔ میں نہیں جانتا کہ اس خصوص میں آپ کو کیا کرنا ہے۔ اور اگر جانتا بھی تو سوائے اس کے کچھ نہ کہتا کہ میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔ گر یہ کہنا بھی میری بے حوصلگی اور دراز نفسی ہوگی کیونکہ دل کو یقین ہے کہ آپ خود جنبشِ قلم سے دریغ نہیں فرمائیں گے۔

اور نوید مسرت سے مجھے شاد کام فرمائیں گے۔

خط (۸۴)

منشی محمد حسن

قبلہ حاجات!

نو آموزِ شیوۂ گدائی تھا اس لئے بہ تقاضائے حیا خاموشی اختیار کر لی تھی مگر دل کے جوشِ تہنیت سے مجبور ہو کر مہرِ سکوت توڑ رہا ہوں۔ ہر چند دل میں مبارکباد پیش کرنے کی ہزاروں آرزوئیں مچل رہی ہیں لیکن اس ترقی سے میں مطمئن نہیں کہ آپ کو اس سے کہیں بلند مراتب پر فائز ہونا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ترقی تو ابھی اس عروج کی ابتدا ہے جو آپ کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔ خدا کرے میری یہ تہنیت ایسی ہزاروں مبارک بادوں کا پیش خیمہ ہو۔

بادشاہ اور وزیر کے مدحیہ قصیدوں کو محض حصولِ مدعا کا وسیلہ بنانا مقصود ہے۔ میری بے سروسامانی کامیابی میں مانع ہے۔ منزلِ مقصود تک رسائی زادِ راہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر مجھے ان کے دربار سے مدح گستری کا کچھ صلہ مل جائے تو کلکتہ جانے کی کچھ سبیل ہو جائے گی۔ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے اس لئے جلد کوئی موقع دیکھ کر قصیدے گزرانے جائیں تو مجھ پر بڑا کرم ہوگا۔

خط (۸۵)

میاں نوروز علی خاں بہادر

اے بہ دل نزدیک و دور از دیدہ گفتارم بہ تست
از تو اَم با دل بود گفتار و پندارم بہ تست

دنیا کا دستور ہے کہ محبت آنکھوں کی راہ سے دل میں اترتی ہے۔ زبان گذارش شوق میں دل کی ترجمانی کرتی ہے اور قلم زبان کا ترجمان ہوتا ہے۔ دید کے بغیر نہ دل اداشناس محبت ہوتا ہے نہ زبان دل کی آئینہ دار اور نہ قلم زبان کا ترجمان۔ مگر یہاں یہ صورت ہے کہ ہرچند آنکھوں کو آج تک دوست کا دیدار نصیب نہ ہو سکا لیکن دل گرفتارِ محبت ہو چکا ہے اور زبان نے آج تک گفتگو نہیں کی۔ مگر قلم دوست تک اس کا پیام پہنچا رہا ہے۔ دید کو دل پر اور زبان کو قلم پر رشک ہے۔ اگر مجبوریاں نہ ہوتیں تو میں خود اس خط سے پہلے دوست کی خدمت میں پہنچ جاتا اور دیدہ و دل اور زبان و قلم اس کشاکش سے چھوٹ جاتے۔

اس سے قبل نواب مظفر الدولہ سیف الدین خاں بہادر لکھنؤ سے تشریف لائے تھے جنہوں نے آپ کے اشتیاق کا حال سنا کر مجھے ممنون احسان بنا دیا تھا۔ اب منشی محمد حسن خاں کانپور سے آئے ہیں اور انہوں نے آپ کا یہ حکم سنایا ہے کہ کہ غالبؔ ہرزہ نوا کے افکار پریشاں کا مجموعہ ان کو دے دیا جائے تاکہ ملاحظۂ عالی سے گزر سکے۔ اس اشتیاق کی خبر نے جو دوسری بار مجھے ملی ہے مجھے دنیا میں بھی سربلند کیا اور خود اپنی نظر میں میری آبرو بڑھ گئی۔

بندہ نواز! میں وہ تنگ ظرف ہوں کہ شرابِ محبت کے ایک دو گھونٹ ہی مجھے مست و بے خود کر دینے کے لئے بہت ہیں اور اک "نیم نگاہِ ناز" ہی مجھے دیوانہ بنا دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجھے اس کا احساس ہے کہ میرا بے مایہ کلام ایسا نہیں کہ کوئی اسے سننے کی آرزو کرے یا اسے پڑھنا چاہے۔ یہ تو دربار بُرد کرنے کے قابل بھی نہیں کہ پانی کی لطافت اس سے متاثر

ہو گی۔ اسے تو آگ ہی میں جلایا چاہیئے۔ بہر حال یہ آپ کا کرم ہے کہ آپ
اس قدر مشتاق ہیں۔

اپنی آزادگی کی وجہ سے آج تک مجھے اس کی توفیق نہیں ہوئی کہ جو کچھ
میں نے لکھا ہے اسے یکجا نقل کر کے رکھوں۔ میرے ایک بھائی نے میری فرمائش
پر نہیں بلکہ خود اپنی خواہش سے اپنی عمرِ عزیز رائیگاں کر کے میری نگارشات
کی ہیں۔ میں وہی اوراق تعمیلِ ارشاد میں روانہ کر رہا ہوں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ انہیں
اچھے کاغذ پر لکھوا کر نقش و نگار زریں سے آراستہ کر کے خدمتِ عالی میں پیش کرتا۔
لیکن منشی صاحب چونکہ پا بہ رکاب ہیں یہ اوراق جوں کے توں بھیج رہا ہوں۔ گویا
مشتِ خس 'سنبلستان' کے اور کاغذی پھول 'گلستان' کی نذر کر رہا ہوں۔ غرض
یہ میری چوالیس سال کی جگر کاوی کا سرمایہ ہے جسے میں آپ جیسے دیدہ ور صاحبِ
دِل کے قدموں میں رکھ رہا ہوں۔

خط (۸۶)

میاں نوروز علی خاں بہادر

امید گاہِ مشتاقان۔

چشم و گوش نہاں خانۂ دِل کے دروازے ہیں۔ محبت کبھی آنکھوں
کے دروازہ سے گزر کر دل میں گھر کر لیتی ہے اور کبھی حسن کی شہرت سُن کر ہی دل
وارفتۂ شوق ہو جاتا ہے۔ مجھے اس پر ناز ہے کہ آپ سے میری محبت و عقیدت

مرہونِ دید نہیں ۔ پھر کسی مشتاق محبت کی اس سے بڑھ کر خوش نصیبی کیا ہوگی کہ بغیر ملاقات کے خاطر دوست تک اس کی رسائی ہو جائے۔

آپ نے میرے کلام کو پسند فرمایا ہے جس کے لئے میں ممنون احسان ہوں۔ لیکن دل یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ ستائش بہ تقاضائے خوبیٔ سخن نہیں بلکہ یادآوری کے احسان کے بوجھ کو کم کرنا مخدوم کے پیش نظر ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ مخدوم نے پیام زبانی پر ہی اکتفا کیا اور مجھے خط سے سرفراز نہیں فرمایا کہ جان و دل منت گزار ہوتے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دوست کی نظر میں شائستہ خطاب نہ تھا۔ اور مجھ سے ناکس کی پرسش اس کے شایانِ شان نہ تھی۔ بہر حال رضا جوئی مقصود ہے۔ تعمیل ارشاد میں مجموعہ نثر فارسی منشی محمد حسن خاں کے سپرد کر رہا ہوں تاکہ ملاحظہ عالی میں پیش کر دیں۔ منشی صاحب چونکہ منزل بہ منزل قیام کرتے ہوئے جائیں گے۔ اس لئے اس کے پہنچنے میں دو ہفتے لگ جائیں گے۔ یہ خط انگریزی ڈاک کے ذریعہ بھیج رہا ہوں تاکہ منشی صاحب کے پہنچنے سے پہلے یہ آپ کو مل جائے اور میری عقیدت و محبت کا اندازہ کر کے آپ مجھے جواب سے نوازیں۔ ہر چند میں نامور نہیں لیکن انگریزی ڈاک والے میرے پتے سے بخوبی واقف ہیں۔ صرف یہ لکھ دینا کافی ہے کہ دہلی میں اسد اللہ کو پہنچے۔

خط (۸۷)

نواب مصطفیٰ خاں

کچھ نہ لکھنے اور کچھ نہ کہنے والے دوست پر ایک وفا شیوہ بندہ سادہ

کی طرف سے ہزار آفریں کہ زبان و قلم کے توسط کے بغیر ہی ایک ان لکھا جواب بھیج کر خاطرِ غمگین کی شادمانی کا سامان بہم پہنچایا۔ میری یہ بے زبانی اور دوست کی رمز شناسی بھی قابلِ داد ہے کہ اس سادگی میں بھی کیا کیا نقش چھپاتے ہیں۔ یہ سادہ ورق گویا مرے نیکیوں کے اعمال نامہ کا آئنہ اور میری چشمِ منتظر کی تصویر ہے اور اس طرح دوست نے گفتنی کی ناگفتہ شرح لکھ بھیجی ہے۔ کبھی سوچتا ہوں کہ نامہ بر راستہ میں اس ورق کے نقش مٹا نہ دیے ہوں۔ یہ سخنِ ناگفتہ، مرے دل پر ... اس لئے جو دل میں ہے اسے زبان پر کیوں نہ لاؤں۔

گماں زیست بود بر منت ز بے دردی
بد است مرگ ولے بدتر از گماں تو نیست

شاید آپ نے یہ سوچا ہو کہ "بے لکھا خط اس خط سے تو بہتر ہو گا جو لکھا تو جائے لیکن اس میں نئی غزل نہ ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ نے غزل کہی ہے اور مجھے نہیں بھیجی لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ مجھے اپنی آمد سے بے خبر رکھنا ستم ہے۔ کیا سادہ ورق اس لئے بھیجا ہے کہ ابھی آپ کے یہاں آنے میں دیر ہے؟ خدا کرے کہ میرا یہ گمان غلط ہو اور آپ جلد آجائیں۔

خط (۸۸)

امین الدولہ آغا علی خاں

عالی جناب نواب صاحب۔

اپنے پارہ ہائے جگر یعنی رشحاتِ قلم کا مجموعہ آپ کی خدمت میں بھیج

رہا ہوں۔ شاید لوگ اس پر ہنسیں کہ کہاں یہ گلدستۂ بے رنگ و بُو اور کہاں وہ انجمنِ گلُ! مگر مری یہ گستاخی بہ فرمانِ محبت اور بہ تقاضائے آئینِ روزگار ہے۔ محبت کی دنیا میں ایسی گستاخیاں نئی نہیں۔ ذرّہ اگر اپنے آپ کو ہیچ سمجھتا رہے تو پھر روکشِ انوارِ خورشید کیوں کر ہو۔ پروانہ اگر جل جانے کو اپنی رسوائی سمجھے تو شمعِ انجمن کا رُخ ہی کیوں کرے۔ اگر محبت درمیان نہ ہو تو بلبل پھول کو دیکھ کر نغمہ سرا کیوں ہو۔ اگر محبت کی کشش کارفرما نہ ہو تو تنکے کہربا کی طرف کیوں لپکیں۔

بندہ نواز محبت و عقیدت روشناسی کی محتاج نہیں ہوتی۔ صورت پرست نہیں معنی شناس ہوں اور آپ کا غائبانہ عقیدت مند ہوں۔ دِل کہتا ہے کہ اگر ممدوح کا استغنا مانعِ پرسش ہے تو جراَتِ رندانہ سے کام لیجیے۔ چنانچہ خوش وقت علی خاں صاحب کان پور جانے لگے تو میں نے یہ نیاز نامہ اُن کے سپرد کیا تاکہ مجھے بھی آپ کے نیاز مندوں میں جگہ ملے اور بے گانگی کا پردہ درمیان سے ہٹ جائے۔ دیوانِ اُردو جو محض چند اوراق پر مشتمل ہے بارگاہِ عالی میں پیش ہے۔ دیوانِ فارسی بھی چند دنوں میں نظرِ عالی سے گزرے گا۔ ایک غزل بھیج رہا ہوں جو مرے سوزِ دروں کی آئینہ دار ہے۔

خط (۸۹)

میر سیّد علی خاں بہادر عرف حضرت جی

در دل ز تمنائے قدمبوسِ تو شوریست!

شوقت چہ نمک داد مذاقِ ادبم را!!

اپنی جان آپ کے قدموں پر نثار کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اس خوش بختی پر جتنا ناز کروں کم ہے کہ مجھ سے ناکس کو یاد فرمایا گیا ہے۔ میں کون ہوں کہ کوئی مجھ پر مہربان اور مجھ سے ملنے کا آرزو مند ہو۔ چہ جائیکہ اس ہستی ستودہ صفات کی خاطر عالی میں مجھے جگہ ملے جو خود آبروئے ہفت دریا اور بہار گلشن رنگ و بو ہو۔ جس کی قدم بوسی کی خود شبلی جیسے عارف حق کو تمنا ہو اور منصور جیسا انا الحق کہنے والا جس کی گفتار پر گوش بر آواز ہو۔ سبحان اللہ خود تجلی طور ایک ارنی گو کی مشتاق ہے مگر حیف کہ ایک مدت سے کشاکش کا شکار ہوں اور غم روزگار نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ مختصر یہ کہ میری کارروائی برسوں رزیڈنسی دہلی اور دادگاہ کلکتہ میں الجھی رہی۔ اس کے بعد وہ بغرض حکم آخر لندن بھیجی گئی۔ اس کو دو سال ہو گئے لیکن آج تک کوئی جواب نہیں آیا۔ جب تک اس معاملہ کی یکسوئی نہیں ہو جاتی میں دلی نہیں چھوڑ سکتا۔ جیسے ہی اس کا تصفیہ ہوتا ہے میں بلا تاخیر سر کے بل گوالیار حاضر ہو کر قدمبوسی کا شرف حاصل کروں گا۔

امید کہ آپ اپنے مریدوں سے جو آستانہ عالی کے فیض یافتہ ہیں ارشاد فرمائیں گے کہ اپنی توجہات میں مجھے شامل کر لیں اور دعاؤں میں آپ کے ارادت مند کو بھی یاد رکھیں۔

طالع یار خاں صاحب کی تشریف آوری کے تیسرے دن گرامی نامہ ملا جسے میں نے حرز جاں بنا رکھا ہے۔ اس وقت تک میری عرضداشت اور فارسی غزلیں ملاحظہ عالی سے گذر چکی ہوں گی۔ اسی دوران میجر جان جیکب کے دو خط ملے جن میں انہوں نے اپنے مکان کی تعمیر پر قطعہ تاریخ لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ میں اس مکتوب کے

ساتھ قطعۂ تاریخ ملفوف کر رہا ہوں۔ اسے ملاحظہ فرما کر مکتوب الیہ تک پہنچا دیا جائے تو کرم ہوگا۔ حکیم رضی الدین حسن خاں جو میرے کرم فرما ہیں اور جن کی دوستی میرے لئے باعثِ تسکین ہے سلام عرض کرتے ہیں اور میری طرح مشتاقِ دید ہیں۔

زیادہ حدِ ادب

خط (۹۰)

مولوی ولایت حسین

قبلۂ حاجات! ہر چند ہجرِ دوست میں جینا دشوار ہے لیکن میری ارادت ایسی استوار ہے کہ اگر ہزار سال بھی فراق کے عالم میں گذر جائیں تو میری وفائیں کم نہ ہوں گی اور مہر و عقیدت بڑھتی ہی جائے گی۔ امید کہ اسی حساب سے آپ کے الطاف بھی روز افزوں ہوتے جائیں گے۔

حافظ کریم بخش جو لاہور گئے تھے اس مہینے کے آخر میں دہلی واپس آئے۔ اور ایک رات کارواں سرائے میں ٹھہر کر دوسری صبح دریا کے راستے یہاں سے روانہ ہوگئے۔ دہلی سے جانب مشرق چار کوس کے فاصلہ پر وہ ابھی شاہدرہ تک ہی پہنچے تھے کہ ان کے بڑے بھائی حافظ قادر بخش مل گئے جو باندا سے بونڈیل کھنڈ جا رہے تھے۔ کریم بخش کو ان کے ساتھ دہلی آنا پڑا۔ وہ چاہتے تھے کہ دو چار روز بھائی کے ساتھ گزارنے کے بعد انہیں رخصت کرکے خود الہ آباد کا رخ کریں لیکن بھائی نے انہیں جانے نہ دیا اور زبردستی انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔ اب بے چارہ آپ کے آستان سے دُور

بیٹھا فریاد کر رہا ہے کہ یہاں میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ کریم بخش نے لکھا ہے کہ وہ ایک مصحف مولوی سعادت حسین کے لیئے لائے تھے جسے واپس لے گئے ہیں۔ اور اب وہاں آئیں گے تو پھر اپنے ساتھ لائیں گے۔ انہوں نے ایک روپیہ گرو گوبند کے نام کا جو والیٔ لاہور کے حکم سے جاری ہوا ہے مجھے دیا تھا کہ اسے الہ آباد بھیج دوں تاکہ آپ اس نئے سکے کو دیکھ کر خوش ہوں۔ میں نے یہ سکہ اپنے خط میں ملفوف کر کے ڈاک کے ذریعہ بھیجا تھا لیکن ڈاک والوں نے اسے مجھے لوٹا دیا ہے۔ یہ نادر سکہ میں نے اٹھا رکھا ہے۔ کوئی ادھر جانے والا ملے تو اس کے ہاتھ بھیج دوں گا۔ نواب ذوالفقار کے بعض احباب جو باندا سے آئے ہیں دیرینہ آشنائی کی بنا پر مجھ سے ملنے آئے تھے۔ گفتگو کے دوران سید نورالدین علی خاں کا ذکر بھی آیا اور مولوی محمد علی مغفور کے پس ماندوں کی باہمی مخالفت کا حال سن کر بہت دکھ ہوا۔ اگر آپ ان کے اختلافات کی تفصیل اور یتیم بچے کی خیریت سے مطلع فرمائیں تو موجبِ تسکین ہوگا۔

دولت و اقبال افزوں ہو اور بخت یاور رہے۔

لے فارسی میں کروہ لکھا ہے جو چار ہزار گز کے برابر ہوتا ہے۔

خط (۹۱)

نواب مبارز الدولہ ممتاز الملک حسام الدین حیدر خاں بہادر

قبلہ حاجات مدظلہ العالی۔

برادرم حسین مرزا نے بعض باتیں گوش گزار کی ہوں گی۔ ابھی یہ افسانہ ناتمام ہے جب تک خود حاضر ہو کر تفصیل عرض نہ کروں پوری بات واضح نہ ہو سکے

گی ۔ لالہ ہری چند صاحب کو نواب امین الدین خاں نے کرنل اسکنر صاحب کے نام ایک سفارشی خط دیا ہے ۔ کیا ہی اچھا ہو اگر لالہ صاحب آپ کی موجودگی میں یہ خط کرنل صاحب کو دیں اور آپ کی سفارش سے ان کا کام نکل جائے ۔ لالہ صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ تم خود میرے ساتھ چلو ۔ مگر میں تو اب کسی کام کا نہیں رہا ۔ امید کہ آپ کے حسنِ التفات سے ان کا کام ہو جائے گا ۔ زیادہ حد ادب ۔

خط (۹۲)

مبارز الدولہ ممتاز الملک حسام الدین حیدر خاں بہادر

قبلہ و کعبہ دو جہاں مدظلہ العالی ۔

آپ کے کرم ہائے بے اندازہ کی سپاس گزاری میں لالہ ہری چند صاحب کا ہم زبان ہوں ۔ آپ نے ان پر جو کرم کیا ہے اور آئندہ فرمائیں گے ۔ اس کی خود مجھ پر منت ہے اور رہے گی ۔ لالہ صاحب غمِ روزگار سے تنگ اور مراتب بلند کے خواہاں ہیں ۔ آپ کا التفات ان کے لئے زینۂ ترقی ہے اور مجھے وہ آپ کے کرم و التفات کا وسیلہ سمجھتے ہیں ۔ امید کہ آپ لالہ صاحب کو اپنے اس گمان سے اور مجھے ان سے شرمسار نہ ہونے دیں گے ۔ زیادہ حد ادب ۔

خط (۹۳)

ذوالفقار حیدر خاں عرف حسین مرزا

مرے عنایت فرما :

آپ کے ہم عمر اور ہم سبق دوست نے آپ کو ایک خط لکھا ہے جس میں انہوں نے آپ سے کوئی کتاب طلب کی ہے۔ ان کا ایک خط میرے نام بھی آیا ہے جس میں وہی مضمون ہے۔ میں وہ خط آپ کو بھیج رہا ہوں۔ مناسب ہوگا کہ آپ انہیں کتاب بھیج دیں یا اس میں کوئی عذر ہو تو اس سے انہیں مطلع کر دیں۔

خدا خدا کر کے کل میرا بخار اترا ہے۔ اگر کل کی طرح آج بھی بخار نہ آئے تو سمجھو کہ مرض سے نجات مل گئی۔ والسلام۔

خط (۴۹)

منشی التفات حسین خاں

مخدوم و معظم!

اسد اللہ آشفتہ سر کی یہ تحریر تقریر کا آئینہ ہے۔ اس کے پاس نہ وہ کمال و ہنر ہے جو آپ جیسے عالی نظر کے التفات کا وسیلہ بنے۔ نہ اسے کوئی حقِ خدمت ہی ہے کہ آپ کے احسان کا دریوزہ گر ہو۔ آپ کی شفقت متاعِ دو جہاں ہے۔ مگر تہی دستی اور سادہ دلی تو دیکھئے کہ خالی ہاتھ ہی اس کا سودا کرنے چلا ہوں۔

مجھے حاکم شہر[1] سے ایک کام آپڑا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ جب تک کوئی سفارش نہ ہو وہ کسی کا کام نہیں کرتا۔ جب ایک آدمی کو اتنے وسیع اختیارات سونپ دیئے جائیں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ اب یہ آپ پر ہے کہ میری مدد اور رہنمائی

---

[1] اصل عبارت میں فرمانروائے شہر ہے۔

فرمائیں۔ میرا امام علی کے ذریعہ حاکم کی موسومہ عرضی بھیج رہا ہوں۔ اگر مناسب ہو تو اسے اپنے پاس رکھ لیجئے اور اسے مکتوب الیہ تک پہنچانے کی کوئی صورت نکالئے اور اگر یہ طریقہ خلافِ آئین ہو تو امام علی سے کہہ دیجئے تاکہ میں خود کل دارالانشاء پہنچ کر جمعدار کے ذریعہ عرضی پیش کر دوں۔ بہرحال آپ کی چارہ سازی اور غم خواری ہی پر تکیہ ہے۔ ورنہ مکتوب الیہ کتنا دیر فہم اور نارس ہے اس کا مجھے اندازہ ہے۔ والسلام۔

خط (۹۵)

میاں محمد نجف

مرکزِ امید کی خدمت میں عاجز کا ہدیۂ نیاز ــــ درد دل کی سمع قبول کو بندگی ــــ مشتِ غبار کی دامن التفات میں آرزوئے پناہ ــــ تنکے کی کہربا کی طرف کشش ــــ بیمار کا مسیحا کو سلام مخمور کا ساقی کو پیام ــــ یعنی دوست سے میری گذارشِ حال ــــ ذوق ہم زبانی نے زور کیا اور دل سے گفتار کے چشمے ابلنے لگے۔ سوچتا تھا کہ جذبات کے اس دوڑ کی دوست کو کس طرح خبر ہو کہ قلم یاوری کے لئے آمادہ ہو گیا اور اس امانت دار کی طرح جو اپنی تحویل کی ایک ایک چیز گناتا ہے۔ دل کی امانت داری کا حق ادا کر رہا ہے یعنی سب سے پہلے آرزوئے دید کا اظہار جو سر مکتوب شوق ہے۔ دوسرے ان دونوں خطوں کی سپاس گزاری جو جہانِ تمنا کے لئے مہ و خورشید اور بوستانِ آرزو کے لئے ابر و باراں ہیں اور تیسرے خط نہ لکھنے کی معذرت۔ حاشا کہ خط نہ لکھنے کی وجہ

فراموشی اور بے گانگی ہرگز نہیں۔ غم روزگار کا یہ حال ہے کہ نفس ہے سو سینہ میں خون ہے اور نکتہ ہے سو آنکھوں میں غبار۔

زنا سازی و ناتوانی بہم | دم اندر کشاکش زپیوند دم
زبس تیرگی ہائے روزِ سیاہ | نگاہ خوردہ آسیب دوش از نگاہ
تن از سایۂ خود بہ بیم اندرون | دل از غم بہ پہلو دو نیم اندرون

حمید الدین صاحب کا سلام پہنچا۔ گویا پیاسے کو آبِ شیریں۔ فقیر کو متاعِ کرم اور بیمار کو دوا مل گئی۔ امید کہ مجھے اپنے مشتاقانِ دید میں شمار کریں گے۔

خط (۹۶)

نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر

برادرِ فرزانہ کی سعادت اور اقبال مندی روز افزوں ہو۔ تمہارے خط لکھنے اور اس کا جواب طلب کرنے پر دل سے دعا نکلی۔ مگر خط لکھنے اور جواب طلب کرنے میں دل پذیری کے اعتبار سے بڑا فرق ہے۔ وہ مہربانی ہے اور یہ بے دردی وہ دلبری ہے اور یہ دلستانی۔ ہر چند دلبروں کے ستم کی طرح تمہاری ہر خواہش گوارا ہے لیکن کیا کروں کہ اب دل میں ناز و وفا سہنے کا حوصلہ نہ رہا۔

میرے عزیز اس سے قبل میری تحریر کا وہ انداز تھا کہ دوسروں کے پڑھنے سے پہلے خود میں اسے دیکھ کر دار فتہ ہوا جاتا تھا۔ اُن دنوں عالم غیب سے نکتہ ہائے راز اُتر کر نہاں خانۂ دل میں گھر کر لیتے تھے اور میرا قلم ان کا ترجمان ہوتا

تھا۔ دل و زبان کے درمیان فکر کے سوا کوئی حجاب نہ تھا اور یہ حجاب بھی اتنا لطیف تھا کہ پڑھنے والے کو لفظ و معنی یک جان نظر آتے تھے۔ اب دل کی وہ کشائش، جاتی رہی تو گفتار میں دل کشی کہاں سے آئے گی۔ شباب تو کسی رنگین شب کی داستان تھی جس سے شبستان ضمیر چراغاں رہتا تھا۔ اسی سے نظم و نثر میں رنگینی اور دل کشی تھی۔ مگر اے درد مند عزیز۔ اب صبح پیری آ چکی ہے۔ وہ بزم خیال درہم برہم ہو چکی اور شمع انجمن دم توڑ رہی ہے۔ اب گفتار و اظہار کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے کوئی رات کے باسی اور کمہلائے ہوئے پھولوں کو بساط شب سے چن کر گلدستہ تیار کرنے لگے۔ ان میں وہ رنگ کہاں کہ نظر افروز ہو اور وہ خوشبو کہاں کہ آرام جاں ہے۔

یاران بزم خصوصاً غیاث الدولہ نواب رضی الدین حسن خاں تمہیں سلام کہتے ہیں۔ اپنے احباب اور خصوصاً خواجہ محمد علی خاں کو میرا سلام پہنچا دو۔

خط (۹۷)

جیمس تامسن سیکرٹری نواب گورنر بہادر اکبرآباد

امیدگاہ خیراندیشان و قدر افزائے نیاز کیشان۔

تسلیم نیاز۔ گرامی نامہ ملا جو آسمان تمنا کا خورشید اور بساط آرزو کا گوہر خوش تاب ہے۔ اس کا عنوان نظر افروزی میں اندوہ ربا اور مضمون دلنشینی میں امید افزا ہے۔ میں اس پر بھی خوش ہوں کہ شب انتظار کی سحر طلوع ہونے میں ابھی کچھ دیر ہے اور دادگاہ ولایت سے ابھی حکم نہیں آیا ہے۔

تا خود پس از رسیدن قاصد چہ رو دہد

خوشش می کنم ولے بہ امید خبر ہنوز

بہر حال آپ کا شکر گزار ہوں کہ مجھ سے ناکس کو آپ نے یاد رکھا ہے
مرے وجودِ خاکی کا ذرہ ذرہ آپ کے لطف و کرم کا ثنا خواں ہے۔ گورنر بہادر
کلکتہ کا حکم نامہ بھی گرامی نامہ کے ساتھ وصول ہوا۔

دعا ہے کہ آپ کے آثارِ جہانگیری و جہانبانی جاوداں رہیں اور
آپ کے فیض و عطا کی دولت روز افزوں ہو۔

خط (۹۸)

جیمس تامسن

عیار افزائے سخن وراں و قدر افزائے مدح گستران صاحب عالی نظر!

آپ کا نیاز مند ہونا میرے لئے باعث شرف ہے اور میں اپنی
خوش بختی پر نازاں ہوں کہ مجھے مدح گری کی توفیق حاصل ہوئی ہے۔ آپ کی انجمن
معیارِ فضل و کمال ہے۔ اس انجمن میں جس کو جگہ مل جائے اس کے فروغِ طالع کا
کیا کہنا۔ دلِ آرزومند کا تقاضا ہے کہ مخدوم سے گذارش کرے کہ اپنے رشحاتِ قلم
سے اسے نوازیں۔ لیکن ادب کہتا ہے کہ مدح کے بغیر آفریں پانا کہاں کی ریت اور
بندگی کے بغیر صلہ کی آرزو کرنا کہاں کا دستور ہے۔ دلِ مدحت گزاری کا خواہاں
ہے۔ جو عنوان صحیفہ نامہ آوری ہے۔ مگر کسی سخن ور کو کوئی ایک غم بھی درپیش ہو تو

سنبع سخن جو عطیۂ الہٰی ہے بجھ کر رہ جاتی ہے۔ مجھ پر تو غم و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔ ایسے میں بھلا کیا دادِ سخن دے سکوں گا۔ قصیدہ چونکہ سرانجام نہ ہو سکا۔ ایک غزل ہی پیش کر رہا ہوں اور نظرِ قبول کا متمنی ہوں۔

تا بسویم نظرِ لطف ز جیبِ تا منست
سبزہ ام گلبن و خازم گل و خاکم چمن است

خط (۹۹)

نواب ضیاالدین احمد خاں بہادر

جانِ برادر۔ اشک و آہِ غالب نامراد یعنی آب و ہوائے اکبرآباد نہیں ساز گار آئے۔ تم مجھ سے بظاہر دور ہو لیکن یک دلی میں دوری کا گذر کہاں۔ اور اب تو تم مرے وطن میں ہو، پھر کیسی جدائی اور کہاں کی دوری۔ مرے شوقِ دور اندیش نے دیدہ و دل تمہارے ساتھ کر دیے تھے کہ غربت میں دیدارِ وطن سے شادماں ہوں۔ ہاں۔ اکبرآباد کے گلی کوچوں سے سرسری نہ گزرنا۔ اس کی ایک ایک رہگذر سے پناہ مانگو کہ یہ آباد ویرانہ یا ویران آبادی مجھ سے مجنوں کی بازی گاہ رہی ہے۔ آج بھی اس کی مٹی میری خون شدہ آرزوؤں سے گل رنگ ہو گی۔ ایک زمانہ تھا کہ یہاں ہر طرف محبت کے سدابہار پھول کھلے رہتے تھے اور نہال دل کے سوا یہاں کوئی درخت بار آور نہیں ہوتا تھا۔ نسیم صبح جب اس گل کدہ سے مستانہ گذرتی تو دلوں کا عجیب عالم ہوتا تھا۔ رندِ صبوحی، بھلا دیتے اور زاہد کے دل سے عبادت محو

ہو جاتی تھی۔ اس سرزمینِ گل کے ایک ایک ذرہ پر دل و جان نثار ہوتے تھے۔
تم نے خط تو لکھا لیکن یہ نہیں بتایا کہ مرے پیام کا رخشِ سنگیں[1] پر کیا اثر ہوا۔
اور مرے سلام کا دریا کی موجوں نے کیا جواب دیا۔

خط (۱۰۰)

شمس الامرا نائب والیٔ حیدر آباد

قبلۂ اہلِ عالم نواب فلک رفعت۔

شکر ہے اس دوری کے باوجود مہجور اور رد دولت سے دور نہیں ہوں
اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ آئینۂ صدق و صفا مولانا عبد الرزاق سے معلوم ہوا
کہ بزم جاوید بہار میں اس خاکسار کا ذکر آیا تھا۔ آپ کا فیض دور و نزدیک حاضر و
غائب سب کے لئے یکساں ہے۔ جس سے آئینہ کو جلا۔ فقیر کو دولت، درد کو دوا اور
آرزو کو نوید کامیابی ملتی ہے۔ فقیر کی تیرہ بختی کے دن بھی ختم ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ مخدوم
کا ضمیر منیر رازہائے نہاں کا آئینہ ہے۔ اس سے یہ حقیقت کیوں کر چھپی رہ سکتی ہے کہ
شعر و سخن سے خاکسار کو ازلی مناسبت ہے۔ ایک مختصر اردو دیوان بہت پہلے شائع
ہوا تھا۔ جو اب گلدستۂ طاقِ نسیاں ہو چکا ہے۔ اس کے بعد کم و بیش تیس برس
طبع جولاں فارسی میں نقش ہائے رنگ رنگ پیش کرتی رہی تا آنکہ گردشِ روزگار

---

[1] آگرہ کے قلعہ سے باہر پتھر سے تراشا ہوا ایک گھوڑا ہے جو رخشِ سنگین کے نام سے مشہور تھا۔

نے اسے پابستہ کر دیا۔ اور فکر کے گوہر شہوار کی آب و تاب جو میری آبرو کی پاسبان تھی جاتی رہی۔ اب کہ صبح پیری کا دھندلکا ہے اور میری اونگھتی قسمت چشم نیم باز سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ فکر انوار سحر سے روشن ہوئی اور سرسٹھ اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ سپرد قلم ہوا۔ یہ قصیدہ مرے سوز دروں کا آئینہ ہے۔ اگر اسے شرف قبول ملے تو میری تنہائی کے لئے موجب تسکین ہوگا اور اسے میں اپنی خوش نصیبی تصور کروں گا۔

بالتفات نیرزم در آرزو چہ نزاع!

نشاطِ خاطرِ مفلس زکیمیا طلبی است

میری دردمندی سے ممدوح کی آنکھ بھر آئے اور دلِ پرسشِ حال پر آمادہ ہو تو سمجھوں گا کہ محنت ٹھکانے لگی۔ یہ خود ستائی نہیں عرض بندگی ہے اور آپ کی کارسازی سے امیدیں وابستہ ہیں۔

قصیدہ

اے مظہرِ کل در ازل آثارِ کرم را

منت بسرِ لوحِ ز اسمِ تو قلم را

شمس الاُمرا کز شرفِ نسبتِ نامش

خور قبلہ بُد اورنگ نشیناں عجم را

دولت روز افزوں اور اقبال جاوداں ہے۔

خط (۱۰۰)

منشی فضل اللہ خاں برادر منشی امین اللہ خاں دیوان راجہ الور

تنگ است دلم حوصلۂ راز نہ دارد
آہ از نے تیرِ تو کہ آواز نہ دارد

ابر بہار اگر اپنی ساری توجہ گوہر سازی پر صرف کر دے تو کھیتیاں کس طرح لہلہائیں۔ پرتوِ مہر کی تابانی اگر صرف ذروں ہی تک محدود رہے تو خوشوں اور شاخوں میں دانوں اور پھلوں کی نمو کیسے ہو۔ اسی طرح قلم جو بے زبانی کی زبان اور زبان دانوں کا راز دان ہے، صرف آرائش گفتار ہی کو مقصود بنالے تو کہنے والا دل کی بات کیونکر کہے! آزادوں کی سادہ تحریر ہی مہر و وفا کا آئینہ اور 'زوائد' اور 'ماسوئی' کو چھوڑ کر عرض مدعا کرنا' حقیقت اخلاص کا ثبوت ہے۔ اصل مقصود تحریر یہ ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ منشی امین اللہ خاں صاحب نے میری جانب سے ایک عرضداشت راجۂ سلطان نشان کی خدمت میں پیش کی اور مہاراجہ کے حضور میری سفارش اور ستائش فرمائی ہے۔ میں منشی صاحب کے کرم کا سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے بہ تقاضائے مہر میری سفارش و ستائش فرمائی لیکن حیران ہوں کہ جو عرضداشت میں نے لکھی ہی نہیں وہ منشی صاحب کو کہاں سے مل گئی اور مرے مخدوم کرم پیشہ نے میرے کہے بغیر راجہ کی خدمت میں میری گزارش کس طرح پیش کر دی۔ دل ان کی اس کرم گستری

پر آفریں اور خود اپنے آپ پر ملامت کر رہا ہے کہ افسوس تو نے دوست کی وسعت کرم کا اندازہ نہیں کیا تھا۔ کاش غالبؔ بے نوا نے خود ہی دوست سے درخواست کی ہوتی تاکہ اس نادیدہ محسن کی منّت نہ اٹھانی پڑتی۔ حیرت ہے کہ اس فرشتہ نے میری طرز تحریر کہاں سے اڑا لی۔ پس آپ سے اتنی گزارش ہے کہ اس عرضداشت کو ملاحظہ فرمائیں اور اس نیاز نامہ کے سواد تحریر سے ملا کر دیکھیں۔ اگر یہ اس سے مختلف نکلی تو اپنے برادر گرامی قدر سے دریافت فرمائیں کہ یہ نانوشتہ تحریر اور نا فرستادہ گزارش ان تک کیسے پہنچی۔

صاحب من۔ میری یہ درخواست بہ سبیل حکایت ہے شکایت نہیں بہ طریق تکلم ہے فریاد نہیں۔ حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے دل بے چین ہے۔ میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔

خط (۱۰۱)

مولوی فضل حق

ہر چند فراموش گشتہ ہوں اور جانتا ہوں کہ دوست مجھے ہیچ سمجھتا ہے لیکن اس پر بھی شکوہ سنج نہیں کہ یہ بھی کیا کم ہے کہ روئے سخن دوست کی طرف ہے۔ فراموشی کے غم جانگداز کو بھلا دینے اور دل کو شکوہ سے باز رکھنے کے لئے یہی کافی ہے۔

از خویشتن بہ ذوقِ جفا با تو ساختیم
با ما دگر مساز کہ ما با تو ساختیم

ان ہی دنوں خیال ہوا کہ چند شعر توحید پر عرفیؔ[1] کے جواب میں کہے جائیں۔ فکر نے ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا جس سے آگے نہ عرفی کا گذر ہو سکتا ہے نہ خود میری رسائی ہو سکتی ہے۔ مجبوراً ان اشعار کو ایک ایسی ہستی کی نذر کر رہا ہوں جو مجھ سے سیکڑوں اور عرفی جیسے ہزاروں کی سخن پروری کر سکتی ہے اور ہر ایک کے مرتبہ کا تعین کر سکتی ہے۔

قصیدہ

اے ز وہم غیر غوغا در جہاں انداختہ
گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ

دیدہ بیرون و درون از خویشتن بردآگہی
پردۂ رسم پرستش درمیان انداختہ

(خط ۱۰۲)

مظفر حسین خاں

ہر چند بیگانگی اور کم آمیزی کا ادا شناس ہوں لیکن آئینِ وفا سے

---

[1] عرفی کا مشہور قصیدہ جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

اے متاعِ درد در بازارِ جاں انداختہ   گوہر ہر سود در جیبِ زیاں انداختہ

پلٹ جانا اور دل کا دو جگہ سودا کرنا میرا شیوہ نہیں ہے۔ ہے۔ میں بے خودی میں کیا کہہ گیا۔ میرے دل غمزدہ کو تو نوروز علی خاں لے گئے۔ اور مجھ سے چھپا کر اپنے ایک دیرینہ دوست کو دے آئے۔ محبت کا کرشمہ تو دیکھئے کہ شمع وصال روشن ہی نہیں ہوئی اور میں داغ فراق کا رونا رو رہا ہوں۔ یہ بھی نوروز علی خاں کی فسوں کاری ہے کہ مجھے آج تک آپ کا قرب نصیب نہیں ہوا مگر نوحہ گزاری میں آپ کا ہم نوا[1] ہو رہا ہوں۔ کاش میری ان سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی اور وہ غم نامہ جو آپ نے انہیں لکھا ہے میری نظر سے نہ گزرا ہوتا۔ اب کہ نشترِ غم رگ جاں میں پیوست ہو چکا ہے اور آنکھوں سے جوئے خوں رواں ہے۔ دل کو کس طرح تسلی دوں۔ ہائے مجھے بھی کبھی یہ زہراب غم چکھنا پڑا تھا اور غم محبوب میں میری دنیا بھی اندھیر ہو گئی تھی۔ کیا ستم ہے کہ اس انیس جان کے تن نازنین کو سپردِ خاک کرنا پڑے جو دم رخصت خدا کو بھی نہ سونپی جاتی تھی اور کیا قیامت ہے کہ اس محبوبہ کو قبرستان چھوڑ آنا پڑے جسے چمن میں لے جاتے اس لئے ڈرتے تھے کہ کہیں اسے چشم نرگس کی نظر نہ لگ جائے۔

جب صیاد کا دام ہی ٹوٹ گیا۔ صید قید و بند سے چھوٹ گیا۔ گل چیں سے پھول چھن گیا اور چمن ہی اجڑ گیا تو کیسی آسودگی اور کہاں کی شادمانی۔ دل دادگان جانتے ہیں کہ محبوب کا عاشق سے اک ذرا التفات بھی کس درجہ کی مہر ورزی اور کیسی مہربانی ہے۔ پھر اس محبوبہ کی جاں نوازی کا کیا کہنا جو غمزہ سے دل لے لے اور محبت میں جان دے دے۔

---

[1] اصل عبارت میں 'ہم خواب' ہے۔

یہ مانا کہ غمِ دوست جاں گزا اور اس کی جدائی جان لیوا ہے لیکن صبر کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔ میرے بھائی موت پر کسی کا بس نہیں ہے۔ پس غم کی اس وادیٔ سموم خیز میں دور تک نہ چلے جانا۔ میرے دیدہ ور دوست عاشق کی ساری پونجی دل ہی تو ہے جسے وہ کبھی محبوب کے جسم نازنین پر نثار کرتا ہے اور کبھی اس کے خمِ زلف پر لٹا دیتا ہے۔ اب نہ وہ جسم نازنین رہا نہ وہ زلف خم بہ خم رہی۔ پھر اس غم [illegible] دا میں اپنی جان کو گھلانے اور دل کو تباہ کرنے سے کیا حاصل۔

دیکھو بلبل سی عاشق زار ہر کھلنے والے پھول کا منہ چوم کر نغمہ سرا ہوتی ہے۔ پروانہ جیسا جاں نثار ہر شمع روشن کا طواف کرتا ہے۔ چمن میں پھول بہت اور انجمن میں شمعیں ہزاروں ہیں۔ پھر ایک پھول کے مرجھا جانے اور ایک شمع کے بجھ جانے کا غم کیوں کرو اور صرف ایک آرزو کے اسیر ہو کر کیوں رہ جاؤ۔ بہارستانِ رنگ و بُو سامنے ہے، تماشا کرو اور میرا یہ شعر پڑھو۔

بر ماغمِ تیمارِ دلِ زار سر آمد دیوانۂ ما را صنم سلسلہ مو برد

صاحبِ من۔ میں یہ دل سوزی کی بنا پر لکھ رہا ہوں۔ گمراہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ آپ کو خط لکھنے میں نوروز علی خاں کو تامل تھا اس لئے میں نے خود یہ جسارت کی کہ میرا دل بیگانوں اور آشناؤں کے غم سے خون ہے۔ اگر یہ تحریر ناگوارِ خاطر ہو تو اسے بھول جائیے اور لکھنے والے سے درگذر کیجئے۔

خط (۱۰۳)

محمد خلیل الدین خاں

فرخ گہر و فرخندہ نگاہ۔

برسوں گذر گئے کہ نہ میں اظہار نیاز کر سکا نہ آپ ہی نے نوازش فرمائی۔
اپنی کم خدمتی پر نادم اور آپ کی بے نیازی پر شرمسار ہوں۔ افسوس کہ آپ نے یہ
بھی نہ پوچھا کہ گردشِ روزگار کے ہاتھوں مجھ پر کیا گذری اور اگر آج تک زندہ
ہوں تو اتنے دن موت سے کیوں کر بچا رہا۔

مختصر یہ کہ لارڈ ہٹنگ کے عہد میں مرے حالات بگڑ گئے اور دشمن کو
کامیابی ہوئی۔ جب تک لارڈ آک لینڈ گورنری پر فائز تھے صورت حال یہ نہ تھی غرض
والیٔ فیروز پور کے رخصت ہونے کے بعد فیروز پور کو سرکاری علاقہ قرار دے دیا گیا۔
میں نے گورنمنٹ کو مدعیٰ علیہ بنا کر کورٹ آف ڈائرکٹرز میں اپنا دعوے پیش کر دیا۔
اور سرکار کے توسط سے اپنی درخواست ولایت بھیج دی۔ لارڈ آک لینڈ کا عہد
فرماں روائی ختم ہو گیا لیکن آج تک مجھے محکمہ صدر سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ جب
لارڈ النبرا گورنری پر فائز ہوئے تو میں نے ان کی خدمت میں دوبارہ اپنی فریاد پیش
کی اور نہیں معلوم کہ یہ میری نادانی تھی یا کار آگہی کہ میں نے انگلستان کی ملکہ کے نام
ایک درخواست انگریزی میں لکھوا کر گورنر بہادر سے گزارش کی کہ اُسے ملکہ عالیہ
کے ملاحظہ کے لئے انگلستان بھیج دیا جائے۔ میری یہ گذارش منظور کر لی گئی اور اب
میرے نام چیف سیکرٹری کا ۵ر اگست کا لکھا ہوا خط الہ آباد سے آیا ہے کہ میری
عرضداشت متعلقہ کاغذات کے ساتھ اس مہینے کے آخر تک سرکاری ڈاک میں ولایت
بھیج دی جائے گی۔ اب آگے قسمت میں کیا ہے دیکھنا چاہیئے۔

آج کل میں گوشہ نشین ہوں اور دودِ دل سے میرا حجرہ کافر کی قبر کی طرح
تاریک ہے۔ شاہِ اودھ کا قصیدہ لکھنا چاہتا ہوں کہ ان کے دربار سے کچھ صلہ ملے۔

لیکن یہ امید اس وقت تک بر آتی نظر نہیں آتی جب تک کوئی قدردان سخن شناس دستگیری نہ کرے۔ نہیں میں نے غلط کہا۔ سخن شناس بہت اور شیوا بیان بے شمار ہیں۔ کوئی ایسا صاحبِ دل چاہیئے جو سخن ور پر مہربان اس کے دردِ دل اور جوہر سے آگاہ ہو اور سخن کی ستائش باندازہ سخن ور اور سخن ور کی تعریف خوبیٔ سخن کے مطابق بادشاہ کے گوش گذار کرے۔ یہ کام آپ جیسے اندازہ داں صاحب مہر و مروّت کے سوا اور کس سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ ورق جو میری قسمت کی طرح سیاہ ہے خدمت گرامی میں بھیجتا ہوں تاکہ آپ کی نظرِ التفات سے گذر کر بادشاہ کی بارگاہ میں بہ طریقِ مناسب پیش ہو۔ والسلام۔

خط (۱۰۴)

نواب مصطفیٰ خاں بہادر

تسلیم نیاز۔

جمعہ کا دن گزرنے کے بعد رات کو بزمِ سخن آراستہ ہوئی۔ میں نے چونکہ غزل نہیں کہی تھی۔ تہی دستی کی شرم سے میرا ارادہ شریک ہونے کا نہیں تھا۔ مگر ضیاء الدین خاں نے مجھ پر دو فرشتے مقرر کر دیے۔ چنانچہ زین العابدین خاں عارفؔ اور غلام حسن خاں محو شام ہی سے مسلط ہو گئے اور مجھے ہاتھی پر بٹھا کر اس طرح اپنے ساتھ لے گئے جیسے کوئی شیر کو پابستہ کر کے لے جائے۔ بہر حال مخدوم و معظم صدر الدین خاں بہادر کے دیدار سے زحمتِ راہ کی تلافی ہو گئی۔ شکر ہے

کہ مولانا صہبائی مشاعرہ میں تشریف نہیں لائے تھے۔ مولانا صہبائی کی طرحی غزل کے دو تین شعر اچھے تھے۔ بحرِ ہزج مثمن میں "درگریبانم نمی آید" طرح تھی۔ میرے احباب میں زین العابدین خاں عارف اور جواہر سنگھ جوہر نے غزلیں پڑھیں اور محفل میں اپنی خوش گفتاری کا سکہ جما دیا۔ جب طرحی غزلیں پڑھی جا چکیں تو میں نے اپنی تازہ غزل سنائی جو اسی روز کہی تھی۔

غزل

صبح شد خیز کہ روداد اثر بنمایم

چہرہ آغشتہ بخوناب جگر بنمایم

یہ خط جمعرات ۲۳ مارچ کو لکھ رہا ہوں۔ عصر کا وقت ہے۔ بوندیں پڑ رہی ہیں اور سرد ہوا چل رہی ہے۔

خط (۱۰۵)

نواب مصطفیٰ خاں

خط اور غزل دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ کل شام حضرت آزردہ کے درِ دولت پر گیا تھا۔ طبیعت کی ناسازی چہرہ سے نمایاں تھی۔ نزلہ زکام میں مبتلا تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ راتوں کو دیر تک جاگتے رہے ہیں۔ حضرت آزردہ مشاعرہ میں نہیں گئے۔ میں تنہا چلا گیا۔ محفل میں بہت سے ریختہ گو آئے تھے۔ بڑی طویل غزلیں پڑھی گئیں اور مشاعرہ آدھی رات تک جاری رہا۔ میں نے پہلے ملک نخواست کی زمین میں

غزل سنائی اور اس کے بعد طرح میں غزل پڑھی۔

چہ عیش از وعدہ چوں باور زعنوانم نمی آید
بہ نوعے گفت می آیم کہ می دانم نمی آید

ضیاء الدین خاں بہادر نے عرفی کے مصرعہ "صد سال می تواں بہ تمنا گریستن" پر طرح رکھی ہے۔ اس زمین میں پہلے ہی طالب آملی کا ایک قصیدہ اور عرفی کی دو غزلیں موجود ہیں۔ پھر غالب بے نوا کس طرح زمزمہ سرا ہوگا۔

خط (۱۰۶)

نواب مصطفیٰ خاں

امید گاہا۔

کل جمعہ کا دن تھا۔ شام کو محفل سخن منعقد ہوئی۔ وہی دونوں عزیز آکر مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ میر نظام الدین ممنونؔ اور مولوی امام بخش صہبائی علالت کی وجہ سے مشاعرہ میں شریک نہ ہو سکے۔ حضرت آزردہ کو لینے آدمی گیا تھا۔ دیر سے تشریف لائے مگر آئے۔ ان کا کلام سن کر دل کو روشنی اور زبان کو نوا ملی۔ میں نے بھی گریستن کی زمین میں قصیدہ پڑھا۔ پہلے تو خیال تھا کہ قصیدہ جو ریختہ گو صاحبان کے لئے دردِ سر کا موجب ہوگا۔ نہ پڑھوں۔ لیکن حضرت آزردہ کے آجانے سے دل بڑھا اور میں نے قصیدہ سنا دیا۔ سحابی بھی بے بلائے مشاعرہ میں آدھمکے تھے۔ میرا قصیدہ سن کر خجل ہوئے اور غزل کے دو چار شعر پڑھنے پر ہی اکتفا کی۔ آج میں سوچ رہا تھا کہ اس

قصیدہ کو نقل کر کے خدمتِ گرامی میں بھیجوں مگر دوپہر تک فرصت نہ مل سکی۔ پھر سحابی اور فتاح آئے سحابی کچھ کبیدہ خاطر سے اور فتاح گلدستہ بدست۔ فتاح نے آپ کا خط دیا۔ اسی وقت آسمان سے بوندیں برسنے لگیں اور میں نے خط سے موتی چننا شروع کئے جن سے دامن مالامال ہو گیا۔ سبحان اللہ کیا غزل فرمائی ہے کہ زمینِ شعر کو آسمان پر پہنچا دیا۔ بلاشبہ سخن سرائی آپ ہی کا حصہ ہے۔ آپ کے شعر کی ستائش کا اہل ہونا ہی میرے لئے باعثِ مسرت ہے۔

خط (۱۰۰)

نواب مصطفیٰ خاں

رشکِ طالب و فخرِ غالب سلامت!

میں نے کرسیتن کی زمین میں آپ کی غزل دیکھی تو خود اپنا قصیدہ میری نظر سے گزر گیا۔ سبحان اللہ کیا غزل ہے۔ اپنے عجزِ بیان کے باوجود اس کے ہر شعر کی تعریف میں ایک مستقل قصیدہ کہنے کو جی چاہتا ہے مگر مقطع کی داد کا حق پھر بھی ادا نہ ہو گا۔

پچھلے مشاعرہ سے پہلے میں نے اپنی غزل حضرت آزردہ کی خدمت میں بھیج دی تھی۔ خیال تھا کہ آپ کے خط میں اسی غزل کو سرمایۂ نگارش بناؤں گا۔ اتنے میں گرامی نامہ ملا اور اسی وقت جواب لکھ رہا ہوں۔

دیدم آں ھنگامہ بے جا خوف محشر داشتم !
خود ہماں شور است کاندر زیست در سر داشتم

خط (۱۰۸)

نواب مصطفیٰ خاں

اے[1] خواجۂ بے پروا میں بندۂ غمگین ہوں اور دل وقف الم ہے۔

آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ آپ کا خط مجھے اُسی دن مل گیا تھا جس دن آپ گئے تھے۔ اِس خط کو دیکھ کر دل و جگر غم سے خون ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ اب کیا کروں کہ معاملہ ہی دگرگوں ہو گیا۔ اسی وقت چل کر عذر خواہی کرنی چاہیے۔ لیکن گرد و غبار اتنا تھا کہ نہ جا سکا۔ شام ہوئی تو تیرگی کچھ اور بڑھ گئی۔ مجبوراً بستر پر جا لیٹا لیکن اِس غمزدہ کے نصیب میں نیند کہاں۔ جس کے زخموں پر غمخوار نے نمک پاشی کی ہو اور جس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہو۔ ساری رات اسی طرح آنکھوں میں کٹ گئی۔ صبح جب خورشید پردۂ شب سے نمودار ہوا تو دل نے رازِ نہانی کو زبان کے سپرد کرنا شروع کیا اور رُوحِ شعر خلوت میں مجھ سے ہم کلام ہونے لگی، نالۂ دل نغمے کے قالب میں ڈھلنے لگا اور کاغذ پر کچھ نقش ابھرنے لگے۔ میں

---

[1] فارسی خط پورا نظم معرا میں مفعولُ مفاعیلن کی بحر میں ہے۔ غالباً مکتوب الیہ نے اسے نثر سمجھ کر ہی پڑھا ہو گا اور انہیں یہ نہ معلوم ہو سکا ہو گا کہ یہ خط منظوم ہے۔ اصل خط بھی اس کے ساتھ درج ہے۔

نے اس غمنامۂ راز اور فہرست نیاز کو خدام در والا کے سپرد کر دیا تاکہ آپ کی خدمت عالی میں پہنچ جائے۔ ہر چند خواجگی کے لئے استغنا زیبا ہے لیکن نیازمندوں کی معذرت کو قبول کر لینا بھی شان خواجگی کے خلاف نہیں۔

والا گہر نبیرہ جو مجھے جان و دل سے زیادہ عزیز ہیں کل صبح کے وقت دیوان نظامی دے گئے تھے۔ اس سے متاثر ہو کر میں نے بھی اسی رنگ میں زمزمہ سرائی کی ہے۔ والا گہر اکبر خاں کو مری دعا پہنچے۔

"اے خواجہ بے پروا۔ من بندۂ غمناکم و رغصہ جگر چاکم، خواہم سخنے گفتن۔ آں روز کہ می رفتند آں نامہ فرستادن کز دیدن آں خوں شد دل تا جگر از اندوہ۔ گفتم چہ کنم غالب چوں کار دگرگوں شد۔ می بایدم اینک رفت تا عذر سخن خواہم چوں گرد و غبارے بود در رفتن نتوانستم۔ آں روز بہ شام آمد لا بلکہ سیہ تر شد۔ سر ماندہ بہ بالیں بر چون غمزدگان خفتم۔ ہے ہے چہ تواند خفت آں خستہ کہ غم خوارش بر زخم نمک باشد و ز دیدۂ بیدارش شورابہ رواں باشد۔ چوں از افق شرقی خورشید درخشندہ ناگاہ سرے بر زد آتشش بہ جہاں در زد مرغ سحرے پر زد رفتم بہ جگر کاوی و آں راز نہانی را از دل بہ زباں دادم۔ در خلوت تنہائی بے پردہ چوں ہم راز آں نے آمد و ہمدم شد۔ چنداں کہ دم اندر نے از مہر دمیدم من، چوں من بہ نوا آمد واں نالہ کہ بر لب بود از باطن نے سر زد۔ آں دم کہ نفس ہائے زیں گونہ کشاکش کرد یک کاغذ نوشتہ بود دستم بدستم در چوں نالہ نمودے داشت زاں شعلہ کہ دودے داشت۔ یہ صفحہ نشانہا ماند۔ گفتم مگر ایں صفحہ غمنامۂ راز استے فہرست نیاز استے باید کہ فرو پیچم واں گہ بہ نشانندے زے خواجہ رواں سازم۔ کوتاہ کنم گفتن۔ آں نامہ کہ من گفتم حجاب در والا

بروند وروان کروند۔ ہرچند دراندیشہ پیداست کہ خوش باشد با خواجگی استغنا۔ بایں ہمہ خوش بنود پوزشش نہ پذیرفتن۔ دیر وز سحر گاہاں روشن گہراں نیر کش روح و رواں دانم بل خوشتر ازاں دانم، دیوان نظامی راآورد بہ سوئے کن۔ زمیں گو نہ۔ نوا با بود در پردۂ گفتارش کز ذوق بہ ہنجارش ایں زمزمہ سرکردم والا گہر اکبر خاں خوانند سلام از من۔“

خط (۱۰۹)

تامسن کے اکبرآباد کی گورنری پر فائز ہونے کی تہنیت

نواب عالی جناب!

آداب بندگی جو مرے لئے سرمایہ نازش ہے بہ عنوان تہنیت بجا لاتا ہوں مخدوم ہنرپرور کا فرماں روائی کے بلند منصب پر فائز ہونا میری خوش بختی کی نشانی ہے اس سے پہلے میری گزارش کے جواب میں آپ نے اپنے قلم گہربار کی چند سطریں جو مجھے مرحمت فرمائی تھیں ان سے میری عزت افزائی ہوئی اور آپ نے اپنے دربار میں، مجھ خاک نشین کی جو پذیرائی فرمائی وہ میرے لئے موجب صد افتخار ہے۔ میں پہلے ہی، بندۂ اخلاص تھا۔ اب رعیت خاص الخاص بھی ہو گیا کہ اکبرآباد میرا وطن ہے۔ میں انتہائی عقیدت سے اپنی بندگی کا اظہار کرتا ہوں اور رعیت پروری کا متمنی ہوں۔ اگر مرے پاس موتیوں کا خزانہ ہوتا تو فرطِ شادمانی میں اُسے لٹا دیتا اور مجھے اِس کی پروا نہ ہوتی کہ نکتہ چیں کیا کہیں گے کہ اس وقت تو میں خوش بختی اور عیش کامی میں اپنے تئیں جمشید و پرویز

کے برابر سمجھتا ہوں۔ جب ہوا خواہوں کا نخلِ تمنا بارآور اور سرسبز و شاداب ہو تو اس مسرت و شادمانی پر حرف گیری کیسی۔ اکبرآباد کی گورنری کو رونق بخشنے کے لئے آپ کی روانگی گویا اس اجڑے دیار کی طرف نسیم بہار کا خرام ہے۔ زمزمہ تہنیت پیش کر رہا ہوں جو میری سرمستیِ شوق کا آئینہ ہے۔

ہوا عبیر فشاں است و ابر گوہر بار
جلوسِ گل بہ سریرِ چمن مبارک باد
رباب نغمہ نواز است و نے ترانہ فروش
خروشِ زمزمہ در انجمن مبارک باد
بہ بزم نغمۂ چنگ و رباب ارزانی!
بہ باغ جلوہ سرو و سمن مبارک باد
زِ شمعہا کہ بہ کاشانۂ کمال برند!
فروغِ طالعِ اربابِ فن مبارک باد
ز بادہ ہا کہ بہ میخانۂ خیال کشند
طلوعِ نشّۂ اہلِ سخن مبارک باد
فضائے آگرہ جولانگہِ مسیح دمیست
زمن بہ ہم نفسانِ وطن مبارک باد
چہ حرف ہم نفسان فرخی زبخت منست
زبختِ فرخ من ہم بمن مبارک باد

بہ من کہ خستہ و رنجور بودہ ام عمری !
نشاطِ خاطر و نیروئے تن مبارک باد
ہزار بار فزوں گفتم و کم ست ہنوز !
گورنری بہ جمسن ٹامسن مبارک باد

آپ کی کرم نوازی سے امید ہے کہ اس تہنیت نامہ کے جواب سے محروم نہ رہوں گا۔

خط (۱۱۰)

مظفر حسین خاں

کلکتہ شہر نگاراں اور زیبائی و رعنائی میں رشکِ باغِ ارم ہے۔ اس شہر میں آپ کا ورود مبارک ہو۔ اعتماد الدولہ کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ نے اپنے خط میں مجھے سلام لکھا ہے۔ یاد آوری اور دل نوازی کا شکر گزار ہوں۔ اب کہ آپ کلکتہ پہنچ گئے ہیں، کیا ہی اچھا ہو اگر آپ شیوا زبان، روشن دل مکرمی امیر حسن خاں تسمل کو میری طرف سے پیام آشتی دیں۔ زنگِ آئنہ ایسا گہرا تو نہیں کہ چھڑائے نہ چھوٹے اور تعلقات خوشگوار نہ ہو سکیں۔ نو واردانِ بزمِ سخن جھوٹی نخوت کے بل بوتے پر سستی شہرت کے خواہاں رہتے ہیں۔ میں کہ اس بزم کا پرانا نغمہ سنج ہوں اور فضاؤں میں میرے نغموں کی گونج آج بھی ہے۔ اگر ہرزہ سرائی کو اپنا شعار بنا لوں تو دنیا تے ادب مجھے کبھی معاف نہ کرے گی۔ فنِ سخن میں جنگ جوئی میرا پیشہ نہیں۔ خدا گواہ ہے کہ نا سزا لاف وگزاف

کے جواب میں ادھر سے جو کچھ لکھا گیا اس میں میرا کوئی اشارہ نہ تھا۔ میں جانتا ہوں کہ شعر عالم قدس کی متاع گراں مایہ ہے۔ اس کو اس طرح اس کے بلند مقام سے گرا دینا کسی دانش ورکو زیب نہیں دیتا۔ باور کیجئے کہ اس ناروا قضیے کے سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا اس میں میری خواہش کو کوئی دخل نہ تھا۔ منشی عاشق علی خاں مغفور سے میری مہر و وفا کا تقاضا یہ ہے کہ میں امیر حسن خاں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھوں۔ نہیں معلوم کہ اس تند خو نوجوان کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے مجھ سے غم زدہ اور گوشہ نشین بوڑھے سے ایسی بے مہری کی۔

بداں معاملہ او بے دماغ و من بے دل
خوشا آں کہ معذرتی حرف بر ستم گردد

مرے دل زنجور میں کینہ کی گنجائش نہیں۔ مہر و محبت میرا آئین ہے۔ امید کہ وہ آزادگی اور انسانیت کا وتیرہ اختیار کریں گے۔ گذشتہ کو بھول کر اپنی خو سے باز آئیں گے اور دوستوں کی خطا سے درگذر کریں گے۔

(خط : ۱۱۱)

امیر حسن خاں

داغم ز سوزِ غم کہ خجل دارم ز خلق
بوئے کہ تن ز سوختن استخواں دہد

میں وہ گدائے رہ نشیں ہوں جو اپنی پھٹی گدڑی کو پیوند لگائے جیتی چیرہ

پر بکھرائے منتظر کرم بیٹھا ہو۔ خود آرائی اور خود نمائی کا یہ اہتمام اس لئے ہے کہ قلم اس صاحب بزم رشک ارم پر گہر ریزے نچھاور کر رہا ہے۔ خود جس کا ضمیر منیر بے شمار گہر ہائے شہوار کا گنجینہ ہے۔ دل جانتا ہے کہ اپنے قصور کی معذرت چاہنا بساطِ دعویٰ آراستہ کرنے سے کہیں بہتر ہے۔ امید کہ نواب عالی مقام و سخنور فرزانہ میری بے نوائی سے درگذر فرما کر اس بات پر باز پرس نہ کریں گے، کہ اگر آرائش گفتار پر قدرت نہ تھی اور دامن متاع سخن سے خالی تھا تو زبان کھولنے کی مجال ہی کیوں ہوئی۔

زمردیں نہ بود خاتم گدا دریاب
کہ خود چہ زہر بُوَد کاں تہ نگیں دارم

مگر اس بے مائگی کے باوجود دل دوستی کا جویا اور زبان دوست کی ستائش کے لئے مضطرب ہے۔ مجھ پر اپنی نمود بے بود کا راز کھل گیا۔ اپنی ہستی پر جو ناز تھا وہ جاتا رہا۔ وہ چشمہ ہی سوکھ گیا جس سے نغمے ابلتے تھے۔ اب نہ خاک میں غبار ہے نہ آگ میں دھواں۔ جب دل ہی بجھ گیا تو جگر کاوی اور خوننابہ فشانی کا حوصلہ کہاں سے آئے۔ اعتقاد الدولہ کے نام آپ کا صحیفہ بہار ساماں مرے لئے پیام صد نشاط کا حامل تھا۔ ہر چند یہ خط ان کے نام ہے لیکن مرے لئے یہی بہت ہے کہ اس میں میرا ذکر تو ہے۔ جس طرح پیاسے کے لئے ایک گھونٹ پانی بڑی نعمت ہے۔ اسی طرح مرے دل مضطرب کے لئے یہ پیام وجہ قرار و سکوں ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ رنجش بے جا مٹ گئی اور رشتۂ اخلاص استوار ہوا۔ مری اس عرض نیاز پر مخلص دوست خوش اور کینہ پسند دشمن چیں بہ جبیں ہوں گے۔ خدا اسی طرح دوستوں کو خوش اور

دشمنوں کو مضطرب رکھیے۔ امید کہ اس کے بعد آپ ہمیشہ مجھے اپنا بندۂ وفادار اور فنِ سخن میں خیر خواہ تصور فرمائیں گے یقین کیجیے کہ اس میں کوئی تصنع نہیں۔ مرے دل میں وہی ہے جو زبان پر ہے اور آئندہ بھی دل و زبان دونوں آپ کے ساتھ رہیں گے۔ اب اگر مجھے زندگی میں کوئی آرزو ہے تو یہی ہے کہ ساری عمر آپ کا نیاز مند بنا رہوں۔ البتہ مجھے آپ سے یہ گلہ ہے کہ براہ راست مجھے خط لکھنے کی بجائے آپ نے غیر کا توسط اختیار فرمایا۔ پتہ سے واقف نہ ہونا کوئی عذر نہیں۔ اس گمنامی اور ناکسی کے باوجود ڈاک والے مجھے جانتے ہیں۔ صرف شہر کا نام اور میرا نام لکھ دینا کافی ہے۔ میرا یہ خط والا تبار مولوی محمد مسیح الدین خاں کو بھی دکھا دیجیے اور انہیں میری تمنائے قدم بوسی پہنچا دیجیے۔

خط (۱۱۴)

امیر حسن خاں

صاحبِ خاقانی پایہ و خسروی سرمایہ!

گرامی نامہ دولتِ دل خواہ کی طرح ناگاہ ملا اور انتظار سے پہلے ہی مجھے انتظار کا صلہ مل گیا۔ زہے نامۂ بہار مشکبار۔

از روئے نگار دل کُش تر | وز بادِ بہار جاں فزا تر

آپ کی اس عنایت اور اپنی خوش بختی پر جتنا فخر کروں کم ہے۔ اس خط میں آپ نے اپنی جو تعریف لکھی ہے میں اس میں آپ کا ہم زبان ہوں۔ خدا گواہ

کہ آپ نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے آپ کہیں بلند تر ہیں۔ بلاشبہ آپ پیکرِ نثر کی جان، زمینِ نظم کے آسمان عرصہ معنی کے شہسوار اور دیارِ ہنر کے خداوند ہیں اور میں ہر حال میں آپ کا مطیع، جاں نثار اور ارادت مند ہوں۔ آپ کا خط لکھنا بہت بڑی نوازش ہے۔ مگر یہ التفات بقدرِ تشنگی نہیں کہ لفظوں سے وہ مہر و محبت ظاہر نہیں ہوتی جس کا دل خواہاں ہے۔

نگاہِ ناز بدل سرنداده چشمہ نوش
ہنوز عیش باندازۂ شکر خند است

محبت میرا دین و ایمان ہے۔ امید کہ آپ دلنوازی سے دریغ نہ فرمائیں گے۔ کبھی کبھی دل میں یہ خیال گزرتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ پرانی رنجش خاطرِ عالی سے مٹی نہ ہو۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو اور دوست کے دل میں مہر و وفا کے سوا کچھ نہ ہو۔

بہ تو اَم زندہ و نادیدہ سراپائے ترا   بہ گمانم سراپائے تو کاں جانِ من است
شرطِ اسلام بُوَد ورزشِ ایماں بالغیب   اے تو غائب زِ نظر مہرِ تو ایمانِ من است

دعا ہے کہ ہم دونوں مل کر غزل سرا ہوں اور خلوص بڑھتا رہے۔

خط (۱۱۳)

نواب مصطفیٰ خاں

آنکھ سے آنسو جاری ہیں صفحہ نم ہو گیا ہے اور خط بھیجنا دشوار ہو رہا ہے۔

اللہ اللہ یارانِ وطن سے آپ کتنی دور ہو گئے اور دہلی سے جہانگیر آباد اور وہاں سے لکھنؤ جا پہنچے۔ خدا کرے کہ پری جمالوں کے دیدار اور شاعرانِ خوش گفتار کے مشاعروں سے زحمتِ سفر کی تلافی ہو جائے۔ مشفقی غلام علی خاں کے حالات سننے سے دل بہت آزردہ ہے۔ خدا جانے آگے کیا ہو۔ ان ہی دنوں کہ دل پریشان اور زبان بے مایہ ہے۔ دو رباعیاں موزوں ہوئیں جنہیں آپ کے ملاحظہ میں پیش کرتا ہوں۔

خط (۱۱۴)

نواب حشمت جنگ بہادر

نواب جم جاہ، سلطان شوکت سلیمان حشمت۔

خدا آپ کا حامی و ناصر رہے اور ہمیشہ فیروزمند اور کامگار رکھے۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آپ کے قدموں سے قریب اور فیضِ کرم سے بہرہ مند ہیں۔ کچھ دن پہلے کرم فرمائے دیرینہ میر کرم علی فرخ آباد سے آئے تھے۔ ان سے دیر تک آپ کی انجمن فیض اثر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میر علی بخش صاحب بھی غریب خانہ پر کئی بار تشریف لائے۔ ہر ملاقات میں صرف آپ ہی کا تذکرہ رہا۔ میری طرف سے پرسش ان کی جانب سے تحسین۔ اُن کی زبان سے دعا اور میری زبان پر آمین! مرے دل میں آستانہ بوسی کی آرزو اور شدید ہو گئی۔ اِن ہی دنوں مشفقی امداد علی خاں کا دہلی آنا ہوا۔ نہیں معلوم کہ میری کشش روحانی تھی یا ان کی اپنی کرم نوازی کہ انہوں نے غریب خانہ کو رونق بخشی۔ اِن سے گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ نواب

معلی القاب کی زبان مبارک پر اکثر غالب کا نام اور محفل میں اس آشفتہ نوا کا کلام پڑھا جاتا ہے۔ کبھی تو میں اپنی اس نام آوری پر ناز کرتا ہوں کہ زبانِ معجز بیان پر میرا نام ہے اور کبھی مجھے خود اپنے کلام پر رشک آتا ہے کہ میرا کلام مجھ سے پہلے روشناسِ انجمن عالی کیوں ہوا۔ بہت دنوں سے دل میں آرزو تھی کہ خدمت گرامی میں اپنی چالیس سال کی جگر کاوی کا حاصل یعنی مجموعہ اشعار فارسی پیش کردوں لیکن دوری اور اپنی بے مائیگی کے احساس کی وجہ سے جرأت نہ ہوسکی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ فقیر روشناسِ سلطان ہے اور شاہ کی خاطرِ عالی پر خادم کی گزارش گراں نہیں گزرتی تو اس خطِ بندگی کے ساتھ مجموعۂ اشعار جو مرے داغ ہائے سینہ کی فہرست ہے، خاں صاحب کے سپرد کر رہا ہوں کہ وہ اس ارمغانِ درویش کو مخدوم کی خدمتِ گرامی میں پیش کریں جس سے درویش نوازی کی صورت نکل آئے۔

نیّرِ دولت واقبال سرچشمۂ فروغ بے زوال ہو۔

خط (۱۱۵)

مجتہد العلماء مولوی سید محمد

تمنائے زمین بوسی۔ خدمت عالی میں تعزیت نامہ بھیجا ہی تھا کہ منگل ۱۱ صفر کو گرامی نامہ اور جمعرات ۱۳ صفر کو عطیۂ سلطانی موصول ہوا۔ آپ کے الطاف وکرم کا تشکر کس طرح بجالاؤں کہ عرقِ ندامت میں ڈوبا جارہا ہوں اور سخن آرائی کی کوشش خودنمائی ہوگی۔ ایسے ناخوش گوار موقعہ پر کہ دیدہ مردم دیدہ

کے ماتم میں سیہ پوش اور شہر کفر و اسلام کے معرکہ سے پرخروش ہے۔ آپ کی یہ بندہ پروری جو حوصلۂ امکان سے باہر ہے محض امامت کا معجزہ اور ولایت کی کرامت ہے

زہے غمزدگی ہیں غم خواری اور مجبوری میں گرہ کشائی نا

۔ خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست۔

تعمیرِ نمونۂ کربلا کا قطعہ تاریخ جو بانی کی مدح پر مبنی ہے اس عرضداشت کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔

خط (۱۱۶)

بہ منشی فضل اللہ خاں از جانب حکیم احسن اللہ خاں[1]

شادم کہ گردشی بہ سزا کرد روزگار

بی بادہ کام عیش روا کردہ روزگار

اس مبارک دور میں جب کہ ساقیٔ دہر کا فیضِ عام ہے بستان سرائے محبت میں برادرِ ہمایوں نظر کا ورود بہار آفریں ہوا۔ اس کے ساتھ عرق مشکِ بو یعنی، عرق کیوڑہ کا تحفۂ جاں نواز ملا جس کا ہر جرعہ خرد فزا ہے۔ یہ وہ رحیق نہیں جس کی بُو ناگوار گذرے اور جس کے پینے سے تردامنی کا رنگ چڑھے۔ بلکہ یہ وہ جاں پرور عرق ہے جس کی خوشبو بھٹی سے کشید ہوئی ہے۔ گویا موجِ آب کو شعلۂ آتش سے نکالا گیا ہے۔ سبحان اللہ یہ وہ عرق ہے کہ اگر اس میں موج اٹھے تو

---

[1] از جانب حکیم احسن اللہ خاں، غالباً کتابت کی غلطی ہے۔ ممکن ہے یہ خط حکیم احسن اللہ کی معرفت بھیجا گیا ہو۔

خضر کے منہ میں پانی بھر آئے۔ اس کو عرق کیوں کر کہوں کہ ایک عرق تو پیشانی پر بھی ہوتا ہے۔ یہ تو اجزائے گُل کی روح ہے جو روح شادی ہے۔ جب تک یہ پھول تھا اس کی صورت اس شہپر کی سی تھی جو مائل پرواز ہو۔ اس کے پیکر نازک کو پانی میں ڈالا گیا۔ آگ دکھائی گئی اور اس کو پگھلا کر زنجیر موجۂ آب کی صورت دی گئی۔ اگر شراب ہوش ربا اور تلخ نہ ہوتی تو میں اُسے گلاب آمیختہ ناب سمجھتا۔ اگر زیبا طلعتوں کے چہرہ کا پسینہ نوشیدنی ہوتا تو میں اُسے عارض حور اور رخسار پری کا پسینہ کہتا۔ وہ مے سر جوش جو جام جمشید میں تھی۔ اور وہ آتش سیال جو پرویز کے پیمانہ میں تھی لاکھ مستی آور اور خرد ربا ہوا کرے لیکن اس میں اس عرق کی سی نشاط انگیزی کہاں۔

اس عطا سے تشنہ لبی کا کچھ مداوا تو ہوا لیکن طبیعت کا اضطراب اور دلِ مہر پیشہ کی بے تابی اسی طرح باقی ہے۔ اس سپاس گزاری کے بعد یہ عرض کرنا ہے کہ اس خط کے ساتھ شفیقی دیوان امین اللہ خاں کا خط بھی ملا۔ ان کی کرم فرمائی کا شکر گزار ہوں لیکن خط کی بے نمکی سے تشنگی کچھ اور بڑھ گئی۔ دل جو سخن ہائے گفتنی سے پُر اور نوا سے خالی ہے فریاد کر رہا ہے۔ دنیا کا دستور ہے کہ غم دشمن سے چھپایا جاتا ہے۔ مگر وائے مجھ پر کہ میں اپنا غم دل دوست کو بھی نہیں سنا سکتا۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ اپنا غم دل بیان کر۔ مگر کہوں تو کیا کہوں۔ کیا یہ کہے دوست یہ نہیں جانتا کہ عمر کا قافلہ کتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔ زمانہ کتنا پُر خطر ہے اور رکا رہائے نازک اس مرحلہ پر کسی دیر کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

گذارش تمام ہوئی۔ ایک غزل جو ابیات دردمندانہ پر مشتمل ہے۔

ملاحظۂ عالی میں پیش کرتا ہوں اور درازیٔ سخن کی معذرت چاہتا ہوں۔

بر دل نازک دلدار گرانی مکناد

خواہش ہا کہ جگر گوشہ ابرامی ہست

والدہ صاحبہ قبلہ دعا فرماتی ہیں اور میں قبول کی دعا کرتا ہوں۔

خط (۱۱۷)

امداد حسین خاں بہادر وزیر شاہ اودھ

قبلۂ عالم و اہلِ عالم!

ایک عرصہ سے آپ کے فضل و کمال اور اوصافِ حمیدہ کا شہرہ سن سن کر یہ سوچتا تھا کہ شایانِ التفات ہونے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ لیکن چونکہ سچی تھی۔ غیب سے یہ توفیق ہوئی کہ زبانِ خاموش یعنی قلم کا سہارا لوں جس کی سرنوشت میں روزِ ازل ہی بارگاہِ عالی کی سجدہ ریزی لکھی گئی تھی۔ شیوۂ سخن وری اور آئین ستائش گری نے انجمن دل کش کی مدح اور گہر سنجی نے قصیدہ میں قطعہ کی طرح ڈالی۔ ذوقِ ستائش کی فراوانی دیکھیے کہ قطعہ کی نظم عرضِ مدعا میں نثر کا کام کر رہی ہے۔ اس نظم میں چونکہ سلطانِ معظم کی مدح بھی شامل تھی ایک اور قطعہ بھی موزوں ہو گیا جو روانی اور صفائی میں چشمۂ آبِ شیریں کے مانند ہے۔ یہ دونوں قطعات ملاحظہ گرامی میں بھیج رہا ہوں۔ مورِ بے مایہ، آصف سلیمان پایہ کی دستگیری کا خواہاں اور گدائے خاک نشین وابستۂ دامانِ سکندر ہونے کا آرزو مند ہے۔ حدِ ادب کا تقاضہ ہے کہ

مور بے مایہ کو سلیمان پر اور گدا کو ارسطو پر چھوڑوں اور خود کو اپنے خداوند کی نعمت کے حوالے کر دوں۔ آفتاب دولت و اقبال ہمیشہ درخشندہ رہے۔

خط (۱۱۸)

انور الدولہ نواب محمد سعد الدین خاں شفق

فکر و معنی کے اس فیضان کا کہنا کہ قلم کو روانی اور زبان کو گفتار ملی۔ بلاشبہ یہی شاعری ہے۔ میں کہ وابستۂ دامن دولت ہوں اس کلام کی ستائش میرے لئے باعث نازش و شرف ہے۔ آپ کی شاعری عطیہ قدرت ہے۔ قلم و فکر آپ کے زیر نگیں اور گنج گوہر معنی آپ کے تصرف میں ہے۔ یہ آپ کا کرم ہے کہ آپ نے غالب رہ نشین کو اپنا مجموعہ نثر و نظم بھیجا جس کا ایک ایک لفظ کوثر و تسنیم میں دُھلا ہوا ہے۔ سبحان اللہ کیا کلام ہے کہ کلیم سے خراج نطق لیتا ہے اور جاں نوازی میں مسیح کے لئے باعث رشک ہے۔ میری یہ مجال کہاں کہ اس کی ستائش میں لب کشائی کروں۔ اور اگر اس ستائش کو اپنی بلند نامی کا ذریعہ بنانا بھی چاہوں تو وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو انداز بیان کی دل کشی۔ فکر کی رسائی اور شیوا بیانی کے شایان شان ہوں۔ سچ کہتا ہوں کہ اس 'سحر نو' کو دیکھ کر غالب آشفتہ نوا کی غزل خود اس کے دل سے اتر گئی۔ اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ نکتہ چین اس کو خوشامد پر محمول کریں گے تو کیا کچھ نہ کہتا اور بات کہاں تک نہ جا پہنچتی۔

عاجزم چوں ورثنائے دوست بازیکم چہ کار
می رُوم از خویش تاگیرد عطار د جائے من!

کرم نامہ ملنے سے دیدہ و دل روشن ہو گئے اور خود کو اس خوش بختی پر مبارک باد دے رہے ہیں۔ نظارہ گواہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ آپ کے کرم کی بدولت قطرہ دریا سے اور ذرّہ آفتاب سے روشناس ہوا۔ اپنی اس فیروزمندی پر جس قدر ناز کروں کم ہے۔

مخفی نہ رہے کہ میں ترک نژاد ہوں اور میرا سلسلۂ نسب افراسیاب اور پشنگ سے ملتا ہے۔ میرے بزرگ ترکستان سے ہندوستان آ کر لاہور میں معین الملک کے وابستگان دولت میں شامل ہو گئے تھے۔ اس اعتبار سے میں آپ کے خاندان کا ناز پروردہ ازلی ہوں۔ اس نگارستان سحر حلال یعنی مجموعۂ خیال کو دیکھ کر خیال گزرا کہ کلام کی داد تو اپنے برابر کے دوستوں اور ہم چشموں کو دی جاتی ہے۔ لیکن آقائے ولی نعمت کی مدح میں شعر کہنا ضروری ہے۔ سو اس گذارش سے مقصود محض روشناسی اور اظہار اخلاص ہے دست سوال دراز کرنا نہیں۔

خط (۱۱۹)

منشی ہرگوپال تفتہ

ان دنوں کہ میری عمر کے روز سیاہ کی شب ہے، میری تیرہ شبی کا اندازہ کرو۔ اس تاریکی میں بے چارہ دل تنہا میری بے کسی پر جل رہا تھا کہ ناگاہ میرا

ظلمت کدہ بے چراغ روشن ہُوا اور میرے زخموں کو مرہم اور درد کو درماں مل گیا اور ایک شخص نے اپنے نطق کی شمع جلائی، جس کی روشنی میں مجھ پر اپنے کلام کی خوبی آشکار ہُوئی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نظر سے پوشیدہ تھی۔

ہاں اے تفتۂ شیوا بیان و نو آئین نوا!

کیا بتاؤں کہ دیدہ وری میں اس روشن طبع دانشور منشی نبی بخش کا کیا پایہ ہے۔ میں اک عمر سے شعر کہتا ہُوں اور رموزِ شعر سے آگاہ ہوں۔ لیکن جب تک اس بزرگوار سے مُلاقات نہیں ہوئی تھی خود مجھے خبر نہ تھی کہ سخن فہمی کیا ہے اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ خدا نے حسن کے دو حصّے کئے۔ ایک حصّہ یُوسفؑ کو بخشا اور دُوسرا ساری دنیا میں تقسیم کر دیا۔ عجب نہیں کہ اسی طرح سخن فہمی اور ذوقِ معنی کے بھی دو حصّے کئے ہوں اور ایک حصّہ اس فرزانہ یگانہ کو بخشا ہو اور بقیہ دُوسروں میں تقسیم کر دیا ہو۔ اب آسمان کی گردش میرے موافقِ حال نہ ہو اور میری سوئی قسمت اسی طرح سوتی رہے تو بھی مجھے کوئی غم نہیں۔ میں اس دوست کے نشاطِ ہمدمی کی بدولت زمانے کی دُشمنی سے بے پروا اور دولتِ دُنیا کے مقابلے میں اس ایک دولت پر قانع ہُوں۔

یہاں روز و شب محفل گرم رہتی ہے۔ کوئی وقت ایسا نہیں ہوتا کہ تمہارا ذکر نہ ہوتا ہو۔ کل جمعہ ۱۵ ربیع الاوّل ۹ فروری کو تمہارا خط ملا، جس سے معلوم ہوا کہ تم اکبر آباد سے متھرا ہوتے ہوئے کول پہنچ گئے ہو۔ ان دو ہزار اشعار

میں سے جن کے بارے میں تم نے لکھا ہے کہ اکبرآباد میں کہے گئے تھے۔ ایک غزل اکبرآباد کے اخبار میں نظر سے گزری۔ بہت اچھی غزل ہے۔ اس میں تم نے وہی روش اختیار کی ہے جو مجھے مرغوب ہے۔ منشی صاحب نے بھی تمہارا خط اور پیام پڑھا جو تم نے ان کے نام بھیجا ہے۔ انہوں نے خواہش کی کہ میں اپنا جواب لکھ کر انہیں دے دوں تاکہ وہ اسے اپنے خط کے ساتھ تمہیں بھیج دیں۔ چنانچہ آج ہفتہ کو یعنی تمہارا خط ملنے کے دوسرے ہی دن میں نے یہ مکتوب ان کے حوالے کر دیا۔ اگر یہ تمہیں جلد مل جائے تو ان کا شکریہ ادا کرو اور اگر دیر سے ملے تو مجھ سے پوچھنا کہ اپنا خط انہیں کیوں دیا اور ڈاک سے کیوں نہ بھیج دیا

عمر و دولت روز افزوں ہو

شنبہ ۱۰ فروری سنہ ۱۹۴۹ء

خط (۱۲۰)

منشی نبی بخش سررشتہ فوجداری ضلع علیگڑھ کول

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت

می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

فکر گواہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ آرائش کے لئے تراش خراش اور نمود

کے لئے صیقل ضروری ہے۔ سرو کو جب تک چھانٹا نہیں جاتا، سہی قد نہیں ہوتا اور شراب جب تک بھٹی سے نہیں گزرتی کیف آگیں نہیں ہوتی۔ قلم تراشنے کے بعد قلم بنتا ہے اور کاغذ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہی خط کی شکل اختیار کرتا ہے۔ پس اس کارگاہ کون و فساد میں کوئی تخریب بغیر تعمیر اور کوئی تعمیر بغیر تخریب ممکن نہیں۔ مجھے مٹی سے بنایا اور آسمان پر لے گئے۔ چند دن نگہداشت کی پھر زمین پر اس طرح پھینک دیا کہ میرا پیکر سطح خاک پر ایک نقش موہوم بن کر رہ گیا۔ چنانچہ اس عالم کون و فساد میں جو ناگاہ ظہور پذیر ہُوا۔ میرے پیکر اصلی کی بجائے ایک وجود خستہ و موہوم رہ گیا ہے، جس کا ہنسنا، رونا اور جینا مرنا سب برابر ہیں۔ اب یہ وجود موہوم بھی معدوم ہوا چاہتا ہے۔

ان ہی دنوں کہ بندِ ستم[1] سے چھوٹ کر بندِ غم میں گرفتار ہوں۔ شاعر جادو بیان از خود رفتہ تفتہ منشی ہر گوپال تفتہ سے ملاقات ہوئی۔ ان سے معلوم ہوا کہ آپ جو وطن گئے تھے (کول) واپس آگئے ہیں۔ حیرت ہے کہ آپ نے مجھے خط سے نہیں نوازا۔ شاید آپ نے تفتہ کے ساتھ میری ہم نشینی و ہم زبانی کو خود اپنی ہم نشینی و ہم زبانی کے برابر سمجھا ہو۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔

کل ایک تیموری شہزادہ نے بزم سخن آراستہ کی تھی اور شعراء کو سخن سنجی کی دعوت دی تھی۔ میری طبیعت کوشش کے باوجود ریختہ کہنے پر مائل نہ ہوئی لیکن مشاعرہ کی رات کو جب میں محفل میں شریک ہونے کے لئے گھر سے چلا

---

[1] غالباً ان دنوں نئے نئے قید سے چھوٹے تھے۔

نو علین رانستہ میں چند شعر موزوں ہو گئے - انہیں میں آپ کی خدمت میں بھیج
رہا ہوں اور آرزو مند ہوں کہ آپ بھی اس زمین میں غزل کہیں اور میرے
پاس بھیجیں -

منگل ۱۶ ربیع الاوّل ۱۲ فروری ، دوپہر دن

خط (۱۲۱)

میرا محمد حسین مکش

تمہارے ضمیر منیر پر جو راز ہائے نہانی کا آئینہ ہے - بے کہے بھی یہ
حقیقت روشن ہوگی کہ دل غم زدہ تمہاری دوری اور جدائی سے رنجور ہے -
تمہیں یاد ہوگا کہ تمہارا پٹودی جانا ہی مجھے منظور نہ تھا ، اب تمہاری مستقل
سکونت وہاں کیسے گوارا کر لوں - آخر اس شہر میں تمہارا گھر بار سبھی کچھ تھا - پھر تم
نے وکالت دلوائی کا کام کیوں چھوڑ دیا -

ان ہی دنوں روشن طبع امیر سلطان شکوہ نصیر الدولہ معین الملک نواب
تجمل حسین خان بہادر مسند نشین فرخ آباد نے میرے قلم کی گوہر افشانی سے
متاثر ہو کر مجھ سے فرخ آباد آنے کی خواہش کی ہے - ہر چند مرے دن گوشہ نشینی
اور نامرادی میں گزر رہے ہیں ، لیکن ان کے مہر و اخلاص کو دیکھ کر فرخ آباد جانے
کا ارادہ ہو رہا ہے - میں چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ چلے چلو - کیا ہی اچھا

ہو کہ تم پٹودی کی اقامت ترک کرکے جو تمہارے شایان شان نہیں ۔اسی ہفتہ مجھ سے آملو۔

ہلاک شیوۂ تمکیں مخواہ مستاں را
عناں گسستہ تر از باد نو بہار بیا

خط (۱۲۲)

شیخ بخش الدین مارہروی

خدائے دانا جو ہر ذرّہ کے راز دل سے آگاہ ہے۔مجھ ذرۂ بے مقدار کی صداقت کا گواہ ہے۔آپ نے لکھا ہے کہ حضرت بر جبیں رفعت صاحب عالم نے مارہرہ کو رونق بخشی ہے ۔مارہرہ کا اب وہ پایہ ہو گیا ہے کہ شہر بغداد سا مرکز فضل و کمال بھی اگر انسانی قالب اختیار کر سکتا تو بلاشبہ اس شرف کی وجہ سے مارہرہ کے طواف کے لئے آتا۔آپ کے خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صاحبِ عالم غالب بے نوا کے کلام کے مشتاق ہیں۔یہ میری خوش نصیبی ہے۔میں خود اپنے کلام کا سپاس گزار ہوں کہ اس کے سبب ایک صاحب دل کی نگاہِ قبول تک رسائی اور ان کی بندگی کی صورت پیدا ہوئی۔میں نے اس سے پہلے غزلوں اور رباعیوں کے دو اوراق بھیج دیئے تھے لیکن دل اس حقیر پیش کش سے مطمئن نہ ہوا ۔اس لئے بڑی جستجو کے بعد میں نے اپنے مطبوعہ دیوان فراہم کئے اور انہیں ڈاک کے ذریعے روانہ کیا۔لیکن

ڈاک والوں نے یہ کتابیں مجھے لوٹادی ہیں۔ اب میں یہ دیوان آپ کو بھیج رہا ہوں تاکہ آپ جس وقت اور جس طرح مناسب سمجھیں۔ ان کو صاحب عالم کی خدمت میں روانہ کردیں۔ اس عنایت کے لئے میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔

خط (۱۲۳)

نواب عبداللہ خاں بہادر صدر الصدور میرٹھ

فلک رفعت قبلۂ حاجات خیراندیشاں و کعبۂ امید درویشاں!

تمنائے قدم بوسی! یاد آوری اور بندہ پروری کا شکر گزار ہوں۔ آپ کے گرامی نامہ سے میری توقیر بڑھی۔ آپ کے التفات نے ذرہ کو مہر سے روشناس کیا اور قطرہ کو دریا سے ہمکنار کیا۔ آپ نے غالب بے نوا سے قصیدہ کی فرمائش کی ہے۔ شاید آپ نے اس فرسودہ جاں اور افسردہ دل کو اس لئے زندہ تصور فرمایا ہے کہ ابھی مرا نہیں ہے۔

گمانِ زیست بُود بر منت ز بے دردی
بدست مرگ و لے بدتر از گمان تو نیست

اگر یہ کام نقاشی اور گلدستہ بندی کی طرح صرف دست و بازو کی مدد سے انجام پاسکتا تو میں اپنی دل خستگی کو بھول کر تعمیل ارشاد کی عزت حاصل کرتا۔ لیکن کیا کروں کہ شعر گوئی کا تعلق دل سے ہے۔ جب دل ہی ٹھکانے نہ ہو تو

زبان سخن کہاں سے ملے ؟ آپ جیسے دیدہ ور صاحب دل سے بڑھ کر اس حقیقت کا شناسا اور کون ہوگا کہ شعر کہنے کے لئے دل کا یک سُو ہونا ضروری ہے۔ یقین کیجئے کہ یہ دل صد پارہ جو میرے سینے میں ہے میرا دشمن دیرینہ بن گیا ہے اور اب سخن گستری اور معنی آفرینی کا اہل نہیں رہا۔

بندہ نواز ! اس درماندگی میں اگر میں شعر کہہ سکتا تو یقیناً قبلۂ دنیا و دیں سُلطان نشان نواب محمد سعید خاں کی مدح میں شعر کہتا کہ اگر اس دنیا میں اس کا صلہ نہ ملے تو بھی دین و ایمان تو سلامت رہتے۔

امید ہے کہ اس گزارش کے بعد آپ نظم و نثر کے لحاظ سے مجھے مُردہ تصوّر فرمائیں گے اور دعائے خیر میں مجھے یاد رکھیں گے۔ دولت و اقبال روز افزوں ہو

خط (۱۲۴)

مرزا اسفندیار بیگ خاں دیوان مہاراجہ الور

قلم اپنے اس اوج بخت پر ناز فرما ہے کہ اسے ایک ایسی بارگاہ عالی میں گزارش کی عزت حاصل ہو رہی ہے۔ جس کا فیض و کرم خاص و عام سب پر یکساں ہے۔ حق تو یہ ہے کہ مسندِ دیوانی کو آپ کے قدموں سے عزت ملی ہے مجھے دفور مسرت میں از خود رفتہ نہ سمجھا جائے تو یہ کہوں گا کہ آپ سے زیادہ خود مہاراجہ قابل مبارک باد ہیں کہ اس تقرر سے ان کے اقبال کی روز افزونی کے اسباب مہیا ہوئے اور دولت مندوں کو دولت کی فراوانی کی نوید اور

غریبوں کو بخشش و داد گری کی بشارت ملی۔ میں بھی اپنے آپ کو مبارکباد کیوں نہ دوں کہ میں اس ریاست کا دیرینہ وابستۂ دولت اور اس آستانے کا پرانا خاک نشین ہوں۔ کیا عجب کہ اس دربار سے اب میرا دیرینہ حق مجھے مل جائے۔

خدا آپ کو یہ دولت و اقبال اور جاہ و جلال مبارک کرے اور گردش آسمان آپ کی تابع فرمان رہے

ہفتہ جمادی الاول ۱۲۷۷ھ

خط (۱۲۵)

نواب محمد علی خاں بہادر عرف مرزا حیدر صاحب

صبح برستانہ بہ بیرِ خانقاہ راو زدم او سخن سر کرد از حق من دم از حیدر زدم

نواب معلی القاب نے جو آزادوں کے لئے قبلۂ حاجات اور دور افتادوں کے لئے کعبۂ امید ہیں۔ سنا ہوگا کہ آج کل شہر دہلی میں ایک آزاد آشفتہ سر نہیں بلکہ ایک آشفتہ نوا سخن ور ہے جو اپنی نواؤں کو رنگین بنانے کے لئے اپنا خون دل پیتا ہے۔ اور جو اپنی رنگین نوائی کے لئے نہیں بلکہ خونابہ آشامی کی بنا پر غالب کہلاتا ہے۔

لے مرزا کے والد چند دن دربار الور کے متوسلین میں شامل رہے تھے۔

غالبِ نام آورم نام و نشانم مپرس
ہم اسد اللّہم و ہم اسد اللّہیم

اگر بزرگوں کی شناسائی کا جویا ہونا گستاخی ہے تو خدا گواہ کہ میری جستجو از روئے خود نمائی نہیں بلکہ بر سبیل معذرت خواہی ہے۔ ہیں کہ ایک عمر سے وابستہ دامانِ دولت ہوں اور میری پیشانی پر اس خاندان کا نشان بندگی ثبت ہے۔ الطاف و عنایات کا آرزومند ہوں۔

میری مختصر سرگزشت یہ ہے کہ میں نے گزشتہ سال کے آغاز میں حضرت سلطان عالم کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا، جسے ایک عرضداشت کے ساتھ قطب الدولہ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ قطب الدولہ نے ازراہِ عنایت اسے مولانا ضمیر سلمہ اللہ تعالیٰ کو دیا۔ جنہوں نے اسے دربار خسروی میں پڑھ کر سنایا۔ اعلیٰ حضرت نے اسے پسند فرمایا اور قطب الدولہ کو حکم دیا کہ عرضداشت پھر کسی وقت پیش کی جائے تاکہ سائل کو اس کا صلہ عطا ہو لیکن بد قسمتی سے وہ انجمن برہم ہو گئی اور قطب الدولہ اپنی خدمت سے ہٹا دیئے گئے۔ مجبوراً انہوں نے وہ قصیدہ اور عرضداشت مجھے لوٹا دی۔ میں نے اسے اٹھا رکھا تھا۔ اب کہ بخت یاور ہے میں وہ قصیدہ اور عرضداشت خدمت گرامی میں بھیج رہا ہوں۔ آپ کے آئین کارسازی اور شیوۂ عاجز نوازی سے میری امیدیں وابستہ ہیں۔ امید کہ آپ قصیدہ اور عرضداشت کو دوبارہ ملاحظہ سلطانی میں پیش کر کے کسی مناسب موقعہ پہ ایفائے وعدہ کی گزارش کریں گے اور شاہ جہاں پناہ کے ستائش گر کو اس کا صلہ دلائیں گے۔ ہے ہے میں

یہ کیا کہہ رہا ہوں۔ آفتاب کو سکھا رہا ہوں کہ تیرگی کس طرح دور ہوتی ہے اور نسیم کو بتا رہا ہوں کہ غنچے کس طرح کھلتے ہیں۔ پریشانی گفتار کی معذرت کے ساتھ اس گزارش کو دعا پر ختم کرتا ہوں۔

آفتاب دولت و اقبال ہمیشہ روشن رہے

خط (۱۲۶)

منشی رحمت اللہ خاں

افسوس کہ آپ کی فرمائش کی تعمیل سے معذور ہوں۔ کیوں کہ اس خواہش کی تکمیل کے لئے قلم کو بے راہ کرنا پڑے گا اور کسی ظلمت کدہ سے گوہر شب چراغ کے لئے روشنی لینی پڑے گی۔ حقیقت یہ ہے فارسی میں خصوصًا نثر میں واسوخت نام کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ جہاں تک مجھے علم ہے سخن وران پہلوی میں ایک نظم مسدس ملتی ہے جسے لوگ واسوخت کہتے ہیں۔ مجھے اپنے حافظہ پر اعتماد نہیں۔ لیکن غالبًا یہ شعر اسی نظم کا ہے

تو نہ آنی کہ غم عاشق زارت باشد

ور شوَد خاک بر آں خاک گزارت باشد

بعض دیدہ ور لکھنؤ کے اردو زبان کے واسوخت کو ملا وحشی کے واسوخت سے ملاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فارسی اور ہندی میں شور انگیزی اور ذوق افزائی کے لحاظ سے زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلوی اور فارسی

زبان کی شان اس سے کہیں بلند ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خوبانِ ہندی کے کرشمۂ ناز اور دل دادگان کی کیفیت کو سوائے ہندی زبان کے کسی اور زبان میں بیان نہیں کیا جا سکتا اور فارسی زبان میں اس طرح کی خرافات کی متحمل بھی نہیں ہو سکتی۔

ریختہ گویان دہلی و لکھنؤ نے ایک طرح نو ایجاد کی ہے۔ اور عورتوں کی زبان میں غزل سرائی شروع کی ہے جسے ریختی کا نام دیا ہے۔ اب واسوخت کی جگہ اسی ریختی کا چرچا ہو رہا ہے۔ مختصر یہ کہ فارسی میں واسوخت کی گنجائش نہیں۔ نثر میں اس کا امکان نہیں اور اردو نظم میں مجھے اس کا ذوق نہیں۔ میں شرمسار ہوں کہ آپ کی فرمائش کی تکمیل نہ کر سکا۔ امید کہ آپ میری معذرت قبول فرمائیں گے۔

خط (۱۲۷)

انوار الدولہ نواب سعد الدین خاں شفق

گرامی نامہ نظر فروز ہوا۔ آپ کی ذرہ نوازی پر بے ساختہ دل سے نکلا

آید بہ چشم روشنیٔ ذرۂ آفتاب

بر ہر زمین کہ طرح کنی نقش پائے را

چشمِ بد دور۔ بلاشبہ اسی کو موتی پرونا کہتے ہیں۔ اس نقش کی دلفریبی کے آگے نقش مانی و بہزاد کی دلکشی قصۂ پارینہ نظر آتی ہے۔ نوابِ معظم احترام الدولہ حافظ

نظام الدین کے خط سے ان اوراق کے نظر ہمایونی سے گزرنے کا حال معلوم ہوا۔ کیوں نہ ہو آپ کا روح پرور کلام اس پر مولانا امجد علی قلق کی ہمزبانی۔ تن مردہ میں جان ڈالنے کے لیئے کافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظی صنعت کے اعتبار سے آپ شاعران گزشتہ سے بازی لے گئے اور لفظ و معنی کو نیا رنگ و آہنگ دیا ہے خدا رکھے آپ اس فن میں نازش ہندوستان ہیں۔

اس گزارش دلنشین کے بعد دل سے جو موج خوں اٹھ رہی اسے قلم کے حوالے کر رہا ہوں تاکہ آپ کو میری دردمندی کا اندازہ ہو۔ ہر چند ایک مدت سے طبیعت اردو شعر کہنے پر مائل نہیں، لیکن کبھی کبھی بادشاہ کی رضاجوئی اور ملکہ عالیہ کے فرمان کی تعمیل میں اردو میں بھی شعر کہنے پڑتے ہیں۔ میری ہوئے مستانہ تھی پایا گیا تھی کہ ایک غزل کے مقطعہ میں ایک ایسا مضمون بندھ گیا کہ ایک بے کمال نے جو ادعائے کمال رکھتا ہے یہ سمجھا کہ روئے سخن اسکی طرف ہے اور اپنی ایک غزل کے مقطعہ میں اس کا حریفانہ جواب دیا۔ ہر چہ در گفتار فخر تست آن ننگ من است ؛ کے مصداق اس کا جواب دینا میری شان سے فروتر تھا۔ چنانچہ قطع نظر کر لینے ہی کو امتیاز کی دلیل قطعی دے کر میں چپ ہو رہا۔

وائے میری سوختہ سامانی کہ نہ مجھے بزرگوں کی طرح سپہ گری کے جوہر ہی عطا ہوئے نہ بوعلی سینا جیسی عقل و دانش ہی ملی۔ آزادوں کی طرح درویشانہ زندگی گزار رہا تھا کہ ذوق سخن نے رہزنی کی اور مجھے یہ سمجھایا کہ آئنہ کو چمکا کر صورت معنی کو اجاگر کرنا بھی بڑا کام ہے۔ اگر سپہ گری اور دانش وری کا حوصلہ نہیں تو درویشی چھوڑ اور سخن گستری کا راستہ اختیار کر۔ مجبوراً میں نے اپنا سفینہ

بحرِ شعر میں ڈال دیا جو بحر نہیں سراب ہے۔ اور قلم میرا علم بن گیا۔ مگر شاید زمانہ میں دیدہ وری تھی ہی نہیں یا تھی تو مرے حصہ کی نہ تھی۔ میرے کلام کی ندرت زمانہ سے چھپی رہی۔ اب یہ حال ہے کہ منہ میں دانت نہیں رہے۔ کان سے سنائی نہیں دیتا۔ بال سفید ہو گئے ہیں۔ چہرہ پر جھریاں پڑ گئی ہیں، ہاتھوں میں رعشہ ہے اور سفرِ آخرت کے لئے تیار بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ آج کیا بو رہا جو کل کاٹوں گا۔

ہاں آپ نے اپنے خط میں خواجہ ظہیر الدین خاں بہادر کا کوئی ذکر نہیں فرمایا۔ یہ مجھ پر ستم نہیں تو کیا ہے۔ مگر پاسِ ادب مانع ہے اس لئے کچھ نہیں کہتا۔ جو کہنا تھا وہ کہہ دیا۔ دل کا غبار دُھل چکا ہے۔ میری طرف سے حضرت وزیرِ اعظم بہادر کی خدمت میں قدمبوسی عرض کیجئے۔ نواب سید محمد خاں کو بندگی، مولانا سید امجد علی کو پیامِ نیاز اور حافظ نظام کو سلام پہنچے۔

خط (۱۲۸)

مولوی رجب علی خاں بہادر

ولی نعمت سلامت

آپ کی مرحمت کا شکر گزار ہوں۔

اس خلعت کا تانا بانا پرتوِ ماہ اور شعاعِ مہر سے بنا ہے۔ یہ عطا ابرِ رحمت اور شمعِ دودمانِ آلِ عبا کا پرتو ہے۔ عرقِ ندامت میں ڈوبا جا رہا ہوں کہ اِدھر

کے ایک ورق کے جواب میں اُدھر سے خلعت فاخرہ سے نوازا جاتا ہے۔
یہ بخشش مہر و محبت کا نشان اور اس حقیقت کی غماز ہے کہ مجھے آپ نے اپنے
نیاز مندان خاص میں جگہ دی ہے۔ اس بندہ نوازی کا شکر گزار ہوں۔ امید ہے
کہ آئندہ بھی آپ مجھے اپنا بندۂ بے دام تصور فرمائیں گے۔ ہر چند آپ کی
شان اس سے کہیں اعلیٰ ہے کہ ایک ترک و تاجیک کی منت گزاری قبول
کرے۔ لیکن میرا فرض یہ ہے کہ اپنے مخدوم و آقا اور ان کی اولاد کے احسان
کا ہر دم شکر گزار ہوں۔ بندہ اپنی مشکل میں اپنے خداوند ہی سے رجوع ہوتا
ہے۔ آپ کا شیوہ کرم ہے۔ جب کرم آپ پر گراں نہیں تو سپاس کرم مجھ پر
گراں کیوں ہو۔

خط (۱۳۹)

عابد علی خاں

آپ جیسے روشن طبع خوش بیان کی تعریف کرنا گویا اپنے آپ کو داد
دینا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ میں یہ سمجھتا تھا کہ مری طرز تحریر مجھی پر
ختم ہے اور اب اس کے بعد کوئی اس طرز کو نباہ نہ سکے گا۔ لیکن آپ کی
تحریر دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ یہ تحریر مرے لئے مژدۂ یگانگی و ہم زبانی ہے
اگرچہ آج تک ہماری ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ لیکن اس ہمزبانی کی وجہ سے
درمیانی فاصلے مٹ گئے ہیں اور آپ مجھ سے بہت قریب ہو گئے ہیں۔ آپ

نے لکھا ہے کہ میں تمہیں بہت دنوں سے جانتا ہوں اور آپ کے اس
کرم نامہ سے ظاہر بھی یہی ہو رہا ہے ۔ پھر آپ نے مجھے خط لکھنے میں اتنی
دیر کیوں کی ۔ یہ ستم نہیں تو اور کیا ہے ؟ اور یہ آپ نے اپنی نگارشات مجھے
بھیجنے کی اجازت کیوں مانگی ہے ۔ اس میں اجازت کیسی ؟ میں تو خود مشتاق
ہوں ۔ اگر آپ اپنی نگارشات مجھے بھیجیں تو یہ خود مجھ پر منت ہوگی ۔

خدا آپ کو ہمیشہ خوش وخرم اور بامراد رکھے ۔

جمعرات ۵ ر اپریل ۱۸۵۳ء

خط (۱۴۰)

قاضی عبدالجمیل بریلوی

آپ نے غالب بے برگ و نوا کو یاد فرمایا ۔ آپ کا شکریہ ۔ میں نے
آپ کی غزلیں دیکھیں ۔ مجھے ان میں کوئی سقم نظر نہیں آیا ۔ جذبات کے اظہار
کا ہر شخص کا اپنا اسلوب ہوتا ہے ۔ اس کا استادی شاگردی سے کوئی تعلق
نہیں ۔ اس کو بدلنے کے لئے ایک عمر کی ہم نشینی اور ہم زبانی چاہیئے ۔ چونکہ
اس کا کوئی امکان نہیں اور آپ نے جو کچھ کہا ہے اور جس طرح کہا ہے وہ
غلط نہیں ہے ۔ اس لئے مبداء فیاض ہی سے فیض حاصل کیجئے ، مشق جاری
رکھیئے اور ایسے شاعروں کا کلام نظر میں رکھیئے جو رموز شعر و معنی سے آگاہ
ہوں ۔ اس سے آپ کی دستگاہ خود بخود بڑھتی رہے گی

۲۸ ر صفر ۱۲۶۹ھ

خط (۱۳۱)

مجتہد العصر مولوی سید محمد

مرتضوی گوہر، مصطفوی اثر قبلۂ دین پرور!

سید محمد آں کہ جبینش زِ نورِ حق
چوں مہ زِ تابِ مہرِ منور لبالب است
گر علم کوکب است ضمیرش بود سپہر
ور دیں بود سپہر دلِ خواجہ کوکب است

مولوی حافظ عبد الصمد کے خط میں اس عاجز و گنہگار کے نام آپ کا سلام پڑھ کر اپنی قسمت پر ناز کر رہا تھا کہ مظفر الدولہ سید سیف الدین حیدر خاں بہادر کے نام کا گرامی نامہ نظر سے گزرا۔ جس میں آپ نے اس ننگ ہستی کا حال پوچھا ہے۔ اس نوازش کا سپاس گزار ہوں اور اپنے آپ کو مبارکباد دے رہا ہوں کہ مخدوم نے مجھے پرسش کے قابل سمجھا۔ اگر اس پرسش میں باز پرس کا انداز ہوتا تو خوف و ندامت سے میری گویائی ہی سلب ہو جاتی۔ لیکن چونکہ یہ پرسش از روئے مہر ہے۔ اگر میں حقیقت حال عرض نہ کروں تو یہ خود مجھ پر ظلم ہوگا: اور لوگ کہیں گے کہ یہ شخص اپنے گناہ پر دلیر اور عذر خواہی سے بے پروا ہے، زبان کا کام موتی پرونا ہے بیہودہ گوئی نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بدگوئی گناہ نہیں لیکن میرا گناہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ میں نے بادشاہ کے فرمان کی تعمیل کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نازک وقت اور ناروا قضیئے میں کوئی اور صورت بھی نہ تھی۔

جس طرح نغمہ کی تخلیق میں مغنی مضراب لگاتا ہے اور تار سے آواز نکلتی ہے اسی طرح مثنوی[1] کے لکھنے میں مضمون سارا بادشاہ کا تھا اور صرف لفظ میرے تھے اس کے علاوہ یہ سارے شعر میرے نہیں۔ اوروں نے اس میں اپنی طرف سے اضافے بھی کئے ہیں۔ بہرحال اب وقت آگیا ہے کہ غزل[2] کے پردہ میں اپنے عقیدہ کا اظہار کروں تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ کنج ناکامی کے خاک نشیں کے دل میں کیا ہے اور گراتباری گلیم کے باوجود اس کی پرواز سخن کہاں تک ہے۔

دعا ہے کہ آپ کا فیض دنیا میں جاوداں رہے اور اس کے ایک پرتو سے غالب سیہ روز کی عاقبت بھی سنور جائے۔

خط (۱۳۲)

خواجہ ظہیر الدین خان بہادر

بندہ پرور۔

جب اللہ نے آپ کو بندہ پرور اور مجھے آپ کا نیازمند بنایا ہے تو ہم زبانی کی آرزو بھی بے جا نہ ہوگی۔ دوستی شکایت کے بغیر بے نمک ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ خود میں نے خط نہیں لکھا۔ اس لئے دوست سے خط نہ لکھنے کا گلہ کرنا بھی

---

[1] غالب نے بادشاہ کی طرف سے ایک مثنوی لکھی تھی جس میں شیعت سے برات کا اظہار کیا تھا۔

[2] مشغول حق ہوں بندگی بوتراب میں۔

ناروا ہے۔ میں نے انوار الدولہ کو لکھا تھا کہ انہوں نے اپنے خط میں آپ کا ذکر کیوں نہیں فرمایا۔ بارے اب حافظ نظام الدین کے خط سے گرد ملال دھل گئی اور معلوم ہوا کہ میرا اسلام قبول فرما لیا گیا ہے۔ اس کے سپاس میں بندگی اور قدمبوسی عرض کرتا ہوں۔ اب آرزو یہ ہے کہ قلم گہر بار کا لکھا ہوا خط بھی فقیر کے کام آئے۔

والا شان خواجہ معین الدین خاں بہادر کا بندۂ بے دام ہوں کہ انہوں نے اپنے بھائی کے نیاز مند کو اپنا نیاز مند تصور فرمایا۔ امید کہ دونوں جانب سے اسی طرح اخلاص بڑھتا جائے گا۔ میں نہیں جانتا کہ خواجہ عبداللہ خاں بہادر کون بزرگ ہیں۔ لیکن آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ کی انجمن کے ماہ تاباں ہیں۔ اس نادیدہ دوست کے سلام کے جواب میں اپنی جان بھی نذر کروں تو کم ہے۔

دولت و اقبال جاوداں رہے

خط (۱۳۳)

سعدالدین خاں شفق

جس بارگاہ عالی کے لئے سجدہ ننگ آستاں ہو۔ عرض مدعا کا حوصلہ کہاں سے آئے۔ کاش میں ماہ و خورشید، بخت فیروز یا دولت جاوید ہوتا کہ میری بندگی ناگزیر سمجھ کر شرف قبول پا لیتی۔ یا مجھے آپ کی نوازش پنہاں کا گمان ہوتا تو بے پوچھے گزارش حال کو آئین بندگی کے خلاف سمجھ کر چپ ہو رہتا۔ لیکن آپ سے یہ پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ آخر اس دل کو جو درد سے رنجور و شکستہ اور اس زبان کو جو ناکردہ گناہ کی عذر خواہی کے لئے بے چین ہے کہاں لے جاؤں۔ ہے ہے

بے خودی میں میری زبان سے کیا نکل گیا "گناہ ناکردہ" یعنی بے گناہی کا دعویٰ۔ ضرور مجھ سے کوئی گناہ ہوا ہوگا۔ جس سے میں بے خبر ہوں اور یہ میری سادگی اور شوخ چشمی ہے کہ اسے میں گناہِ ناکردہ سمجھ رہا ہوں۔ امید کہ آپ اگر میرا کوئی گناہ ہے تو اس سے ورنہ اسی دعوٰے بے گناہی کے جرم سے جس کا مجھے اعتراف ہے درگزر فرمائیں گے۔

نواب سید محمد خاں بہادر کی خدمت میں بندگی۔ خواجہ ظہیر الدین خاں بہادر کو تمنائے ملاقات، میر امجد علی صاحب کو آداب و نیاز۔ منشی نادر حسین خاں کو سلام شوق اور حافظ نظام الدین کو میرا شکوۂ فراموشی پہنچا دیجیے۔

ہمیشہ قسمت سازگار، دولت پرستار اور غالب پرستش کا سزاوار رہے۔

منگل ۷ محرم سنہ ۱۳۷۱ھ ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۹۵۲ء

خط (۱۳۴)

نواب علی بہادر مسند نشین باندہ

والا شان و محیطِ احسان جناب نواب صاحب

آپ کے خاندان کا روشناس قدیم اور یگانوں میں ہونے کی وجہ سے مجھے آپ کی مسند نشینی پر تہنیت پیش کرنی چاہیئے تھی کہ آئین وفا کا تقاضا یہی تھا۔ لیکن میں تہنیت نہ گزار سکا۔ خدا گواہ کہ اس میں میری بے پروائی کو کوئی دخل نہ تھا۔ بلکہ یہ احساس مانع رہا کہ بندۂ ناچیز ہوں اور ندیمان بزم اُنس کی ہم نشینی کے قابل نہیں۔ اب کہ خود آپ نے اپنے التفات سے نوازا ہے سوچتا ہوں کہ پہلے اپنی

ہمت کی کوتاہی کی عذر خواہی کروں یا آپ کے الطاف و نوازش کا شکریہ ادا کروں خدا آپ کو خوش رکھے کہ آپ نے میرے دل سے بوجھ اتار کر مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ آپ کے مخمس مسدس اور غزلیں دیکھیں۔ سبحان اللہ کیا لطف طبع، جدت ذہن اور فکر سلیم ہے۔ جب آغاز ہی میں یہ رنگ ہے تو وہ دن دور نہیں کہ تھوڑی سی مشق اور محنت سے آپ اس فن میں یکتا ہو جائیں گے۔ میں نے آپ کے ارشاد کی تعمیل میں اصلاح سے کلام کو آراستہ کر دیا ہے۔ اگر رموزِ فن سے آگہی مقصود ہو تو ریختہ کہنے والوں میں میر و مرزا اور فارسی گویوں میں صائب، عرفی، نظیری، اور حزیں کا کلام نظر میں رکھیئے۔ نظر میں رکھنے سے مراد یہ ہے کہ جوہر لفظ اور فروغ معنی پر غور کر کے خوب و ناخوب میں تمیز کرنی چاہیئے۔ اگر "پنج آہنگ" میری تصنیف نہ ہوتی تو کہتا کہ یہ کتاب فارسی کے لیئے "قانون" کا حکم رکھتی ہے اور دقیق و نازک نکات نادر ترکیبوں اور فصیح و شیریں الفاظ کا قیمتی ذخیرہ ہے۔ یقین جانیئے کہ دیوان فارسی و اردو کا کوئی نسخہ یا میری دوسری نگارشات کا کوئی ورق میرے پاس نہیں ہے۔ دوست ان کے اصلی مسودے لے جاتے رہے اور انہیں چھپوا کر کتب فروشوں کے ذریعہ دور دور کے شہروں میں فروخت کرواتے رہے میں نے آپ کے ارشاد کی تعمیل میں ہر طرف آدمی دوڑائے لیکن اردو اور فارسی دیوان کا کوئی نسخہ ہاتھ نہ آیا۔ صرف پنج آہنگ کی ایک جلد مل گئی۔ جسے شرمساری کے ساتھ آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ دوسری کتابیں جب بھی دستیاب ہوں روانہ کر دوں گا۔

اردو میں شعر بہت کم کہتا ہوں۔ مدت سے طبیعت فارسی گوئی کی طرف

مائل ہے ۔ لیکن حضرت ظلِ الٰہی کی رضائے خاطر کے لئے کبھی کبھی اردو بھی کہہ لیتا ہوں ۔ چند غزلیں جو ابھی تک میرے ہاتھ سے گئی نہیں ہیں آپ کے پاس بھیج رہا ہوں ۔ انہیں ملاحظہ فرمائیے اور اسی طرز و اسلوب پر لکھنے کی کوشش فرما

خدا آپ کو زمانے کی نظر بد سے محفوظ رکھے اور دولت خداداد کا چراغ صبح قیامت تک فروزاں رہے ۔

خط (۱۲۵)

سعد الدین خاں شفق

آپ کی اس پیاپے ذرہ نوازی کا شکر گزار ہوں کہ پہلے خط اس کے بعد دو قصیدے دو مخمس ایک غلط نامہ پھر کل مثنوی کے تین نسخے مولد ہمایوں کا ایک رسالہ اور مصری کے پینتالیس کوزے وصول ہوئے ۔ اس مصری کی حلاوت کا کیا کہنا کہ جان سے زیادہ شیریں ہے ۔ اس میں ایسی مٹھاس گھلی ہوئی ہے کہ اس کے مقابلے میں شکر کی شیرینی برائے نام معلوم ہوتی ہے ۔ اگر شاہد ارمنی (شیریں) کو اس کی حلاوت کا اندازہ ہوتا تو اپنی ساری شیرینی بھول جاتی اور فرہاد کی کوشش اور جنبش تیشہ کے بغیر جوئے شیر موج زن ہو جاتی ۔ یہ مصری نہیں فردوس کی نہر انگبیں کا حباب ہے بلکہ یوں کہیئے کہ جنت کی شہد کی نہر کو کوزہ میں بند کر دیا ہے ۔

میری کیا بساط کہ چشم و چراغ دودمان شرافت خواجہ منیر الدین خان بہادر کی شادی کی مبارکباد پیش کروں ۔ میں جمشید و پرویز نہیں، مہر و ماہ نہیں کہ اس انجمن

میں بار پاسکوں، جسکے دارا و سکندر پاسبان ہیں اور ناہید جہاں غزل سرا ہے۔

میں نے آپ کا خط اور مثنوی وزارت پناہ احترام الدولہ بہادر کی خدمت میں پیش کی اور اس کے بعض حصے پڑھ کر سنائے۔ محفل آفرین و مرحبا کے نعروں سے گونج اٹھی۔ بادشاہ سلامت تندرست اور بعافیت ہیں۔ لیکن محل ہی میں آرام فرماتے ہیں اور بہت کم برآمد ہوتے ہیں۔ لوگوں کو اب پہلے کی طرح ان کے حضور باریاب ہونے کا موقعہ نہیں ملتا۔ اب وہ اگلا سا ذوق کلام بھی نہیں رہا۔ مجھے بہر حال ہر صبح آستانۂ شاہی پر حاضری دینی پڑتی ہے۔ مثنوی قصائد اور دونوں مخمس ساتھ رکھتا ہوں کہ موقعہ ملے تو پیش کروں۔

آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ اس خط میں نہ تو قبلہ و کعبہ سید محمد خاں بہادر کا حال ہے نہ مولانا میر امجد علی کی کوئی کیفیت۔ عنوان خط دیکھ کر میں نے سمجھا کہ شاید شہر کے محلات کی کوئی فہرست یا ہمسایوں کے جمع و خرچ کا حساب ہوگا۔ غالباً منشی حافظ محمد بخش صاحب کی احتیاط کی بناء پر پتہ میں یہ تفصیلات لکھی گئی ہیں لیکن حیران ہوں کہ پچھلے خطوں میں جب میرا نام اور شہر کا نام لکھا جاتا تھا تو اس وقت کونسا خط گم ہوا تھا کہ اب ہمسایوں کا نام لکھنا پڑا کہ ان کے پتے سے ڈاک کے کارکنوں کو میرا گھر ملے۔ مجھے ڈاکیہ سے لے کر پوسٹ ماسٹر تک سبھی جانتے ہیں۔ تیس برس سے اپنا گھر بیچ کر کوبکو پھر رہا ہوں کوئی معین اور مستقل ٹھکانا نہیں کسی جگہ بھی دو تین برس سے زیادہ ٹکنا نصیب نہیں ہوا۔ اس کے باوجود جہاں بھی رہوں میرا خط مجھے مل جاتا ہے پھر میں نے اپنے ننگ و نام کے خیال سے نہیں لکھا بلکہ طویل پتہ لکھنے میں بے جا قلم گھسنا پڑا ہوگا۔ جس کا مجھے افسوس ہے"

دعائے دولت دوام کے سوا اور کیا لکھوں۔ مشفقی نادر حسین خاں صاحب کا شکر گزار ہوں کہ وہ مجھ سے ملنے کے طالب ہیں۔ مگر یہ اشتیاق صرف ادھر ہی نہیں میں بھی ان سے ملنے کا آرزو مند ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہوا منشی صاحب اس آرزو میں شریک غالب ہیں۔

خط (۱۳۶)

رُوح اللہ خاں

آں پیکرِ اتحاد را تاب و تواں　　داں کالبدِ وداد را روح و رواں
نی نی بہ نَفَس زندہ کُن ہم نفساں　　آں ہم نفَسِ مسیح رُوح اللہ خاں

سلام نیاز۔ مخدوم زادہ شیریں بیان مولوی حافظ غیاث الدین خاں کے خط کا جواب عرض کر رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ اس ستودہ خو کے دل میں کیا آئی کہ مجھ سے ننگ دیں اور ننگ خرابات کی دانش وری اور بزرگی کو سراہا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ غالبِ گم نام اپنی خرابی اور فتادگی میں یکتا ہے۔ غالباً یہ فرزانہ یگانہ میر قاسم علی خاں کی غلط نمائی کی بنا پر ہے کہ ذرہ کو خورشید اور قطرہ کو دریا سے ملایا جا رہا ہے۔

میں کہ دوستوں کا وفا پیشہ دوست ہوں یہ سوچ رہا ہوں کہ آخر مخدوم بندہ پرور کہاں رہیں۔ وحید الدولہ بہادر کے خط سے تو معلوم ہوا تھا کہ سید صاحب کانپور تشریف لے گئے تھے۔ اب یہ خط آپ نے لکھنؤ سے لکھا ہے۔ جب

آپ نے یہ خط لکھ کر راہ سخن کھولی ہے تو کرم ہو گا کہ عنوان خط پر مقام روانگی اور مفصل پتہ بھی لکھ بھیجیں تاکہ مجھے خط لکھنے میں سہولت ہو۔

آپ کے اس خط نے محبت کے ایک کرشمہ میں دو کام کئے۔ آنکھوں کو دیدار جو کیا اور زبان کو آفریں گو بنایا۔

دعا ہے کہ قلمرو شادی و شادمانی کی فرمانروائی آپ کا مقدر ہو۔

خط (۱۳۷)

میر واجد علی خاں بلگرامی

سلام نیاز کے پردہ میں انجمن ہمایونی میں حاضر ہو رہا ہوں۔ اگر تکرار تجلی روا ہو تو آپ کے دوسرے خط کا یہی تقاضا تھا مگر آپ نے میرا کام آسان کر دیا آپ کی نظم و نثر بارگاہ خسروی میں پیش ہوئی۔ خط اور تحفہ کی خوش خبری سے آپ کو اندازہ ہوا ہو گا کہ بہ سبیل تعارف کیا کہا گیا تھا اور زبان معجز بیان سے کیا ارشاد ہوا۔ مفت کی منت رکھنا آزادوں کے آئین کے خلاف ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ کام تنہا میری کوشش سے نہیں ہوا بلکہ احترام الدولہ بہادر بھی اس میں شریک غالب تھے۔ یعنی میں نے وزیر با تدبیر سے عرض معروض کی اور انہوں نے بادشاہ سے گزارش کی۔

مناسب ہو گا کہ دیدہ و ردانا مولانا ظہیر الدین خاں بھی اس محسن (احترام الدولہ) کے نام موزوں لفظوں میں شکریہ کا خط لکھ کر میرے پاس بھیج دیں۔ جسے میں ان

کی خدمت میں پیش کردوں گا۔ نظم کے دو ورق بھیج رہا ہوں ۔ یہ آپ کے ملاحظہ کے قابل نہیں ۔ مگر یہ نہ دیکھئے کہ کس نے لکھا ہے ۔ صرف یہ دیکھئے کہ کیا لکھا ہے ۔

خط (۱۳۸)

مولوی رجب علی خاں

خدا کا لاکھ لاکھ شکر اور بخت خداداد پر ہزار آفریں کہ خواجہ خستہ نواز اور بندہ پرور ہے اور کسی حال میں اپنے وابستگان دامن سے غافل نہیں ۔

خود پیش خود کفیل گرفتاری من است
ہردم بہ پُرسش دل مایوس می رسد

حیران ہوں کہ جو خط مارچ ۱۹۵۱ء میں لکھا گیا تھا وہ مارچ ۱۹۵۲ء تک کہاں رہا ۔ نہ پتہ ہی غلط تھا نہ بھیجنے والے یعنی مولانا باقر بے پروا تھے ۔ کہیں یہ تو نہیں کہ اس کے مضامین شوق کی گرانباری ڈاک والوں کی سبک روی پر بار ہو گئی ہو اور انہیں دو سو کوس کا فاصلہ طے کرنے میں ایک سال لگ گیا ہو ۔ بہرحال یہ تردّد ایسا نہیں کہ دیر رسی کے شکوہ کو اس خط کے جلد مل جانے کے شکریئے پر مقدم رکھوں ۔ میں یہ سمجھ کر چپ ہو رہا تھا کہ میرا پہلا خط چونکہ تفسیر سورۂ هَلْ اَتیٰ کے شکریئے میں لکھا گیا تھا ۔ اس لئے آپ نے اس کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا ہو گا ۔ بہرحال مرزا خاور کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے آپ سے میرا ذکر کیا جس کی بنا پر آپ کو میری یاد آگئی ۔

آپ نے حکم دیا ہے کہ شاہان تیموریہ کی تاریخ ملاحظہ عالی میں گزاروں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تاریخ ابھی صرف چند ہی اجزا پر مشتمل ہے۔ حمد و نعت منقبت والی عصر کی مدح اور سبب تالیف کتاب کے بعد صرف نصیرالدین ہمایوں کے عہد تک کا حال قلمبند ہوا ہے۔ باقی داستان کل پر چھوڑ دی گئی ہے۔ اگر زندگی مہلت دے تو تعمیل ارشاد کی عزت حاصل کروں گا۔

سورۂ والفجر کی تفسیر کے اوراق مہینے کے شروع میں نظر افروز ہوئے اور مضامین دل نشیں ہو گئے۔ کیا عجب کہ ان اوراق سے میرے نامۂ اعمال کی سیاہی دُھل جائے۔

خط (۱۳۹)

میر مہدی

میرے نور چشم جہاں بین!

خدا تمہیں خوش رکھے کہ انتظار سے پہلے ہی دیدۂ دیدار جو کے لئے سامانِ نشاط بہم پہنچایا۔ شہر جے پور کی خوبی اور والئ جے پور کی خوش خلقی کا حال سن کر بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں۔ ایسے گراں مایہ گوہر مشکل ہی سے زمانہ کے ہاتھ آتے ہیں۔ راجہ بکرماجیت کو گزرے دو ہزار برس ہوئے تب راجہ رام سنگھ جیسا ایک حکمران پیدا ہوا اور دنیا نے بکرماجیت کے بارے میں جو سن رکھا تھا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یہ سمجھا کہ دو ہزار برس کی گردشِ چرخ و انجم رائیگاں نہیں گئی۔

خدا ایسے انصاف پرور حق شناس اور حق نگر حکمراں کو زندگی جاوید عطا کرے۔

مرزا احمد حسین اور مرزا قربان بیگ نے تمہارا خط پڑھا اور سات سو من مصری کے شربت کی حلاوت کے تصور ہی میں مزے لینے لگے۔ بات بادۂ ناب کی نہ تھی ورنہ میرا دل بھی للچانے لگتا۔ تمہاری خواہش کے بموجب وہ سات شعر جو خاقان سپہر آستان کی خدمت میں پیش کئے تھے حاشیے پر لکھ رہا ہوں۔

خط (۱۴۱)

میر مہدی

بادشاہ نے بشارت دی کہ جمعہ ۵ ؍ فروری کو قلعہ معلیٰ میں مشاعرہ ہوگا۔ سخن ور حاضر ہوں اور داد سخن پائیں۔ چنانچہ مشاعرہ میں شاہزادگانِ بابریہ اور شہر کے لوگ بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔ تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ سب سے پہلے سلطان الشعراء شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ نے بادشاہ کی غزل اس انداز سے سنائی کہ زہرہ کو بھی وجد آگیا ہوگا۔ اس کے بعد شاہزادہ حضر سلطان طرح میں غزل سرا ہوئے۔ محفل جھوم جھوم اٹھی۔ پھر مرزا حیدر شکوہ، مرزا انور الدین اور میرزا عالی بخت عالی نے بھی طرحی غزلیں سنائیں اور خوب داد سخن پائی۔ غالب آشفتہ نوا کو پہلوئے عالی میں جگہ ملی تھی۔ اس نے بھی طرح میں دس شعر سنائے۔ محوی نامی ایک لڑکے نے جو خمکدۂ صہبائی کے مے آشاموں میں تھا۔ نشید مستانہ بلند کی۔ مرزا حاجی شہرت نے کم و بیش ستر شعر کی غزل پڑھی۔ میں اکتا کر پیشاب کے بہانے نکل آیا۔ اس وقت

تک شہر کی دوکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ چراغ روشن تھے۔ ابھی آدھی رات نہیں گزری تھی۔ میں گھر آکر دیر تک اپنی اکتاہٹ کو شراب میں ڈبوتا رہا۔

صبح ہونے کے بعد پھر قلعہ معلیٰ پہنچا۔ چاروں شہزادوں نے جن کے نام لکھ چکا ہوں وہی رات کی غزلیں سنائیں۔ میں نے بھی اپنی غزل پڑھی۔ معلوم ہوا کہ مشاعرات پھر ہوتا رہا اور صبح کے قریب محفل برخواست ہوئی۔ آخر میں سلطان الشعرا (ذوق) نے دو غزلیں سنائی تھیں۔ لیکن طرح میں نہیں۔

نوروز کو اکیس روز رہ گئے ہیں۔ دیکھئے طبیعت کس انداز سے خروش آمادہ ہوتی ہے۔ تمہارے خط میں ایسی کوئی بات نہ تھی کہ دل بے اختیار ہوجاتا۔ یہ غلط ہے کہ اجنٹ جے پور آرہا ہے۔ وہ تو گوالیار سے اجمیر جائے گا۔ اور وہیں ٹھیرا رہے گا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں راجہ کے حضور پچھلی دو غزلیں اور یہ غزل پڑھنے سے کیوں منع کیا گیا ہے۔ اگر موقعہ ملے تو ضرور پڑھ ڈالو بلکہ یہ کاغذ بھی جو میں بھیج رہا ہوں پیش کردو۔ نا بھائی یہ رائے درست معلوم نہیں ہوتی۔ جس شخص کے ذریعہ راجہ تک رسائی ہوئی ہے اس کے توسط کے بغیر کسی تحریر کا پیش ہونا غالباً مناسب نہ ہوگا۔ سننے والا نہ سخن ور ہے نہ سخن رس نہ سخن داں۔ پھر سنانے سے کیا فائدہ

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

غزلوں پر خود ہی نظر ثانی کرلیا کرو اور دیدہ و دل کو تحقیق میں مشغول رکھو اور جو سنو اور دیکھو اس سے مجھے بھی آگاہ کرتے رہو۔

ہنری لارنس راجستان کا اجنٹ اسی جان لارنس کا بڑا بھائی ہے جو

دہلی کا کلکٹر اور مجسٹریٹ تھا۔ اس بات کی کسی اور سے تحقیق کیا کروں۔ ساری دنیا جانتی ہے اور میں بھی واقف ہوں۔

اچھا بھائی ان قصوں کو چھوڑ اور میری طرحی غزل دیکھ۔

خط (۱۴۱)

ممتاز الملک حسام الدین حیدر خاں بہادر

قبلہ حاجات۔

اپنی کم خدمتی پر نادم ہوں کہ طبیعت نثر نگاری پر مائل نہیں۔ اگر اپنے خاص طرز پر نہ لکھوں تو "چیستاں" کی تعریف اور خط کے جواب کا پورا حق نہ ہوگا اور اپنی طرز بدلتا ہوں تو ناموس سخن وری پر حرف آتا ہے۔ پس یہ سرسری جواب ہی میری معذرت ہے۔ بہرحال تعمیل ارشاد کی بہترین تلافی یہ رباعیاں ہیں۔ انہیں زریں کاغذ پر لکھوا کر ظفر الدولہ کے خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ فتح علی خاں کے خط اور کتاب چیستاں کی تعریف عام لکھنے والے کیا کر سکتے ہیں۔ مبارز الدولہ بھی کورنش بجا لاتے ہیں۔ اور مبارک باد عرض کرتے ہیں۔ چار رباعیاں رویائے صادقہ کی تبریک میں پیش ہیں۔

بر دل از دیدہ فتح باب است ایں خواب

باران امید را سحاب است ایں خواب

زنہار گماں مبر کہ خواب است ایں خواب

تعبیر ولائے بوتراب است ایں خواب

بینائی چشمِ مہر و ماہ است ایں خواب
پیرایۂ پیکرِ نگاہ است ایں خواب

بر صحتِ ذاتِ شہ گواہ است ایں خواب
بیداری بختِ بادشاہ است ایں خواب

خوابے کہ فروغ دیں ازو جلوہ گر است
در روز نصیبِ شہِ روشن گہر است
پیراست کہ دیدن چوں خواب بروز
تعجیل پذیرئ دعائے سحر است

خط (۱۴۲)

حسام الدین حیدر خاں

قبلہ و کعبہ دو جہاں سلامت۔

بدر الدین آیا اور کہنے لگا کہ آپ نے دو غزلیں مانگی ہیں۔
میں نے سمجھا کہ مثنوی کو غزل کہہ رہا ہوگا پھر پلٹ آیا اور وہی بات دہرائی۔
میں نے کہا اچھا بھائی غزلیں کہہ لوں تو بھیج دوں گا۔ مگر اس کے جانے کے بعد
خیال آیا کہ شاید ان دو شعروں کے بارے میں کہہ رہا ہو جو آپ نے مجھے بھیجے

تھے۔ بہرحال یہ چند شعر لکھ رہا ہوں۔

یاد باد آن ذوق کاندر قطع صحرائے جنوں
خود عصائے بود گر در پائے خارے رشتہ‌ام

اتفاق سفر افتاد بہ پیری غالب
آنچہ از پائے بنیامد ز عصا می آید

تا سر خار کدامیں دشت در جاں می خلد
کز ہجوم ذوق می خارد کف پایم ہنوز

نم اشکی چو بخاکم بفشانی از مہر
خاک بالد بخود و مہر گیا خیزد ازو

یہ اشعار ان مضامین پر تو مشتمل نہیں جو آپ نے عطا فرمائے ہیں لیکن اپنے مسودات میں سے روا روی میں ان شعروں کا انتخاب کر لیا جن کے مضمون میں آپ کے دیئے ہوئے مضامین سے کسی قدر مناسبت تھی۔

زیادہ حد ادب

خط (۱۴۳)

حسام الدین حیدر خان بہادر

خداوند نعمت و سلامت۔

مجھ سے ناچیز کو یہ سزاوار نہیں کہ آپ کو بے حساب زحمت دے کر

راہِ ادب سے تجاوز کروں۔ لیکن کیا کروں کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ پس میری بے کسی ہی میری گستاخیوں کی معذرت ہے۔ اب مجھے ایک ہی تدبیر نظر آتی ہے کہ آپ کسی آدمی کو بھیج کر اندرجیت اور ہیرالال کو اپنے حضور طلب فرمائیں اور اس وقت مجھے بھی یاد فرمائیں اور دورانِ گفتگو یہ ذکر چھیڑ دیں کہ اسد اللہ جو پہلے ہی تمہارا مقروض ہے" تنگدستی کے ہاتھوں ملول پریشان ہے۔ اسے مزید ایک ہزار روپے دے دو تو اس کا کام بھی نکل جائے گا۔ اور خود تمہیں بھی اس سے فائدہ ہو گا۔

زیادہ حدِ ادب

خط (۱۴۴)

حسام الدین حیدر خان بہادر

قبلہ و کعبۂ دو جہان:

مجھے آج ایک انگریز صاحب سے ملنے کے لئے جانا ہے۔ جن کا گھر شہر سے باہر چھاؤنی میں محلدار خاں کے باغ کے قریب ہے۔ مُرداد کے سُورج کی تپش سے ہراساں ہو رہا ہوں۔ اگر پالکی عنایت ہو تو آپ کی مہربانی کے سہارے میں وہاں پہنچ سکتا ہوں۔ دوپہر کو ملاقات کا وقت مقرر ہوا ہے اور اس وقت آپ آرام فرما رہے ہوں گے۔ اس لئے کہاروں سے فرما دیجئے کہ فلاں شخص آئے گا اس کو جہاں جانا ہو پالکی میں پہنچا دیں۔

تسلیم نیاز کے سوا اور کیا عرض کروں

خط (۱۴۵)

حسام الدّین حیدر خاں

کیا بتاؤں کہ نورِ دیدۂ غالبِ آشفتہ نوا یوسف مرزا کے جانے سے مجھ پر کیا گزری۔ بلا وجہ زحمت سفر اٹھائی اور فرخ آباد میں جدۂ ماجد سے بھی نہ مل سکے ہوں گے۔ میر مہدی نے جے پور سے اور یوسف علی خاں نے بنارس میں سے آپ کو سلام لکھا ہے۔ کاش آپ یہاں آتے اور مرے پاس جو کچھ ہے وہ مجھ سے حاصل کر لیتے۔

آپ کے خط کا جواب یہ ہے کہ شہر کے لوگوں سے کسی بحث میں نہ الجھئے شعر میں ہر شخص کا اپنا انداز اور آہنگ ہوتا ہے۔ دوسروں کے طرز سے قطع نظر کر کے خود اپنی آگہی اور استعداد بڑھانے کی کوشش کرتے رہیئے۔

خط (۱۴۶)

مولوی عبدالوہاب لکھنوی

یاد فرمائی کا شکریہ۔ آپ آگرہ تشریف لے گئے ہیں جو میرا وطن ہے اس لئے میں یہیں سے سجدہ ریز ہوتا ہوں۔ جب آپ لکھنؤ تشریف لے

جائیں تو میری طرف سے سلطان العلما سے ادباً عرض کریں کہ دل جو ایک قطرۂ خون ہے اس کوہ الم کا بار اٹھا نہیں سکتا۔ مجبوراً ایک قطعہ سپرد قلم کیا۔ جس کا چوتھا مصرعہ یہ ہے۔

آمدہ سالِ رحلتش داغ جگر گداز ہائی

اس کے جواب میں خداوند (سلطان العلما) جو ارشاد فرمائیں اس سے مجھے آگاہ فرمایئے۔

نواب محمد علی خاں بہادر نے اپنے بائیں ہاتھ سے جو سلام لکھا ہے اسے میں نے دیکھا اور یہ جانا کہ دل بھی چونکہ بائیں پہلو میں ہوتا ہے اس لئے یہ سلام نہ دل سے لکھا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ عرب کے پہلوانوں میں ایک دلاور ایسا گزرا ہے جو دونوں ہاتھوں سے یکساں شمشیر زنی کرتا تھا۔ اس لئے اس کا لقب ذوالیمینین پڑ گیا تھا۔ پس وہ ذوالیمینین سیف تھا اور نواب جو دونوں ہاتھوں سے لکھتے ہیں ذوالیمینین قلم ہیں۔

مشفقی مرزا حاتم علی مہر نے ایک عرصہ سے مجھے خط نہیں لکھا تھا اور اب آپ کے خط کے آخر میں مجھے سلام لکھا ہے اور اپنے دستخط ثبت کر دیئے ہیں۔ اسے ان کا حسن اخلاق کہیئے یا حسن اتفاق کہ وہ آپ کی محفل میں تھے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ فلاں شخص کو خط لکھا جا رہا ہے تو سوچا کہ چلو اپنا سلام بھی اسی میں لکھ بھیجیں۔ اب مجھ سے بیچارہ کے لئے جس کا دل گلہ سے پُر ہے سوائے اس کے کیا چارہ رہ گیا ہے کہ مہر کا سلام از رُوئے مہر مہر ہی کو لوٹا دُوں تاکہ سلام علیکم و علیکم السلام کی رسم پُوری ہو جائے۔

خط (۱۴۷)

سلطان زادہ بشیر الدین میسوری

نامۂ شرف افزا مرے حق میں شہپرِ ہما کا سایہ ہوا جس سے مجھے ملک شادمانی کی فرماں روائی مل گئی - اوراقِ اشعار دریا دریا برسنے والا ابر گہربار اور چشمِ قلم گنجینہ گوہرِ معنی ہیں - سچ تو یہ ہے کہ آپ میدانِ سخن کے شہسوار ہیں اور دانشور آپ کے غاشیہ بدوش -

میرا یہ حال ہے کہ ایک مدت سے زبانِ سخن سنج خاموش ہے - نہ جسم میں جان رہی نہ فکر میں روشنی - عمر کی سرسٹھویں منزل سے گزر رہا ہوں - پچاس برس دلی اور دلی والوں کی چاہت میں گزر گئے - ہائے اس مدت میں کتنے یکدل دوست اکٹھے ہو گئے تھے - مگر گردشِ فلک نے ان رشتوں کو اس طرح کاٹا کہ رگِ جاں سے خون ٹپکنے لگا - کتنے عزیز تیر بارانِ حوادث کے شکار اور اس نامراد ہنگامے کی نذر ہو گئے - جو باقی رہ گئے ہیں ، وہ سینوں میں داغ کشتگاں لئے پھر رہے ہیں - میں کہ شہر اہلِ شہر اور بیتے دنوں کا ماتمی ہوں ، مرنے کی آرزو میں جی رہا ہوں -

نثر کی تین کتابیں پنج آہنگ ، مہرِ نیم روز اور دستنبو خدمت گرامی میں روانہ کر چکا ہوں - معلوم نہیں تیسری کتاب ابھی پہنچی یا نہیں - نظم اردو کا مجموعہ بہت مختصر ہے اور اس قابل نہیں کہ اہل فارس کے سامنے اس کا نام لیا جائے - کلیات فارسی مرے پاس نہیں ہے - صرف مطبوعہ دیوان ہے -

جو کلیات کا آدھا ہے۔ بہرحال اگر دستنبو آپ کو مل گئی ہو تو یہی گلدستہ بے رنگ و بو یعنی مجموعہ نظم فارسی اور اگر نہ ملی ہو تو دونوں کتابیں ارمغان خدمت کروں گا۔ اس خصوص میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔

ہے ہے یہ آپ کے دل میں فقیر کی کتابوں کی قیمت پوچھنے کا خیال کیسے گزرا۔ بندہ پرور! فقیر بے سرمایہ ہے فرومایہ نہیں۔ سخن ور ہے سوداگر نہیں۔ موتنہ پوشش ہے گداگر نہیں، عطا قبول کر سکتا ہے۔ قیمت نہیں لے سکتا۔ آزادوں کی طرف سے شہزادوں کی خدمت میں جو پیش ہو وہ نذر ہوتی ہے اور شہزادے آزادوں کو جو عطا کریں وہ تبرک۔ اس میں بیع وشریٰ اور چون و چرا کیسی۔ فقیر نے جو بھیجا ہے اور جو بھیجے گا۔ اسے ارمغان سمجھئے۔

ہر شب شبِ عید اور ہر روز روزِ نوروز رہے

خط (۱۴۸)

گل محمد خاں ناطق مکرانی

ناطق رنگین نوا کو غالب ہرزہ سرا کا سلام ——— آفتاب کو ذرہ
دریا کو سراب۔ کامل کو ہیچ اور ہست کو نیست کی طرف سے تسلیم!

گرامی نامہ ملا اور تن مردہ میں جان پڑ گئی۔ اب میں وہ غالب نہیں جو ہر دم سخن سرائی اور آرائش گفتار میں مشغول رہتا تھا۔ جو پانی کی طرح شراب

پنپتا تھا اور اگر شراب نہ ملتی تھی تو خون دل پنپتا تھا۔ اب تن دل سے خستہ تر اور دل دلبروں کے پیمان سے شکستہ تر ہے۔ آنکھیں پیمانہ خون ہیں اور جسم داغوں کی کثرت سے سرو چراغاں بنا ہوا ہے۔ خزاں کی پت جھڑ لگ چکی ہے۔ نو مہینے کی مدت میں اجزائے حیات مرتب ہوتے ہیں۔ مگر میں نو مہینے بیمار پڑا رہا بلکہ جزو بستر بنا رہا۔ اب (چارہ گر) مجھے قلزم خون سے نکال کر ساحل پر ڈال گئے ہیں حال یہ ہے کہ زندہ ہوں نہ مُردہ۔

یہاں کے احباب مرے کلام کا مجموعہ چھاپ رہے ہیں، جو قصائد، غزلیات، قطعات اور مثنویوں پر مشتمل ہوگا۔ یہ چھپ جائے تو آپ کی خدمت میں روانہ کر دوں گا۔ میرے شعر پر آپ کا تامل اور تنقید درست ہے۔ میں آپ کی عبارت نقل کر کے اس کا جواب عرض کرتا ہوں۔ آپ نے لکھا ہے۔

"مثنوی کے ایک شعر میں ایک لفظ ہے۔ جسے کاتب نے "پنجہ" لکھا ہے، یہ کیا لفظ ہے؟ اگر پنجہ ہی ہے تو سور کے تو پنجے نہیں سُم ہوتے ہیں۔ اگر سم کی بجائے پنجہ کا استعمال شعراء کے نزدیک جائز ہے تو مطلع فرمایئے تاکہ مجھے بھی حقیقت کا علم ہو سکے۔"

دم ذوالفقار کی تیزی اور حیدر کرار کے فروغ گوہر کی سوگند۔ اگرچہ میں نے اس جانور کو خرابوں اور ویرانوں میں بہت دیکھا ہے لیکن اس کے پاؤں کبھی غور سے نہیں دیکھے۔ میرا گمان تھا کہ اس کے پاؤں بھی کتے بلی کی طرح ہوتے ہوں گے۔ اب آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ سور کے سم ہوتے ہیں۔ پنجے نہیں۔ اگر کلیات چھپنے سے پہلے آپ کا خط مجھے مل جاتا تو میں اس

مصرعہ کو بدل کر "پنجہ زدن سازکرد" کی بجائے "بدنفسی سازکرد" ——
لکھ دیا۔ بہرحال اس چوک پر مجھے ملال نہیں کیوں کہ یہ سہو سخن ور کے طرزِ سخن
سے ناشناس ہونے کی دلیل نہیں بلکہ سور کے پاؤں کی ساخت سے لاعلمی
کے سبب ہے۔ اس سے نفسِ مفہوم میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔

ذوقِ ہم زبانی اس کی اجازت نہیں دیتا۔ کہ قلم ہاتھ سے رکھ دوں لیکن
جو گفتنی تھا وہ کہہ چکا ہوں اس لئے ختم کرتا ہوں۔

والسلام

خط (۱۴۹)

مولانا محمد عباس بھوپالی

غالب سخن گزار کے بہت سے دوست ایسے ہیں جنہیں آنکھوں نے کبھی
نہیں دیکھا لیکن جو اس کے نہاں خانۂ دل کے مکیں ہیں۔ ظاہربین زمانہ جسے دفورِ
مسرت سے آنکھوں میں چمکنے والے ستاروں اور آنسوؤں میں تمیز نہیں،
اس قربِ جاں نواز کی حقیقت کو کیا سمجھے گا۔ حاشا کہ مجھ سا پست پایہ بلند نام
دنیا میں اور کہاں ہوگا۔ جو اپنی درماندگی کے سبب ایک شہر کا خاک نشیں ہو۔
اور قلم کے توسط سے نامورانِ عالم کا روشناس ہو۔ میری آپ سے روشناسی
بھی ایسی ہی ہے۔

بہت دنوں سے فارسی نثر چھوڑ رکھی ہے اور اردو میں بے تکلف

خط وکتابت کا انداز اختیار کر لیا ہے۔ اب آپ نے فرمائش کی ہے کہ آپ کے نام فارسی میں خط لکھوں۔ سو تعمیل ارشاد کر رہا ہوں۔ جنبشِ قلم کا نتیجہ یہ چند لفظ ہیں جو صرف پڑھے جا سکتے ہیں۔ کسی تعریف کے قابل نہیں۔

خط (۱۵۱)

محمد حبیب اللہ منشی نواب ممتاز الملک بہادر نائب والی حیدرآباد

خدا کا لاکھ لاکھ شکر اور قسمت کی فرخی پر آفریں —— نامۂ امید افزا انعام الٰہی کی وہ فہرست ہے جو آسمان سے میری طرف بھیجی گئی یا وہ گنج گراں مایہ ہے جو روز ازل میرے حصہ میں لکھا گیا تھا اور اب مجھے مل رہا ہے۔ یہ بہت بڑی خوشخبری ہے کہ متاعِ سعادت پہنچا ہی چاہتی ہے۔ اور منزل مراد قریب آگئی ہے۔ ہر چند ابھی منشور خداوندی مجھے نہیں ملا ہے۔ لیکن یہ بھی بہت ہے کہ مجھ سے گوشہ نشین کا نام دفتر ہمایونی میں درج کر لیا گیا ہے۔

غالب بخود ببال کہ گشتیم روشناس

در دفترِ وزیر نوشتند نام ما

گزشتہ اگست میں نو مطبوعہ دیوان اُردو موم جامہ میں لپیٹ کر وزیر فلک رفعت کی بارگاہ میں روانہ کیا تھا۔ گرامی نامہ میں اس کے پہنچنے کا ذکر نہیں ہے اور فارسی مجموعہ بھیجنے کی خواہش فرمائی گئی ہے۔ غالباً نواب کی ایما پر دیوان اُردو بیکار سمجھ کر فارسی مجموعہ طلب فرمایا گیا ہے۔

ماہ نیم ماہ بھیجنے کا بھی حکم ہوا ہے۔ افسوس کہ ماہ نیم ماہ ایک ایسا نام ہے جس کا مسمّیٰ کوئی نہیں۔ پرتوستاں کا نصف حصّہ مکمل ہوا تو اس کا نام مہر نیم روز رکھا گیا۔ دوسرا حصّہ لکھنے کی ابھی نوبت نہیں آئی تھی کہ خود کارفرما کا کام تمام ہوگیا۔ اور ترکمانوں کی سلطنت دیرینہ ہی مٹ گئی۔ پس "ماہ نیم ماہ" اٹھائیسویں کے چاند کی طرح ناپید ہے اور صرف اس کا نام مہر نیم روز میں عنوان بے نشان بن کر رہ گیا ہے۔

پنج آہنگ، مہر نیم روز اور دستنبو تو پہلے ہی بھیج چکا ہوں۔ اب صرف مجموعۂ نظم فارسی بھیجنا رہ گیا ہے۔ میرے پاس اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔ شہر میں جو چند نسخے بعض لوگوں کے پاس تھے۔ وہ بھی اس قیامت میں ادھر ادھر ہوگئے۔ تباہی کے بعد جب حالات ذرا سنبھلے تو ایک عزیز دوست نے بڑی زحمت و تلاش کے بعد پارہ پارہ جوڑ کر پچاس جزو کے قریب فارسی کلام مرتب کرلیا ہے۔ اب اس کے چھپوانے کی فکر میں ہوں۔ اگر چھپنا ممکن نہ ہوا تو پھر کسی اچھے کاتب کو ڈھونڈوں گا اور اس سے کلام نقل کروا کے خدمت والا میں بھیج دوں گا۔ کاتب کی اُجرت طباعت کے مصارف سے بہت کم اور میری بساط سے باہر نہ ہوگی۔

براہ کرم اپنے بارے میں مطلع فرمائیے کہ آپ دفتر وزارت میں کس خدمت پر فائز ہیں اور آپ کے گوہر فروزندہ کا کس معدن سے تعلق ہے تاکہ اسی کے مطابق آئندہ نیاز نامے گزران سکوں۔ یہ بھی لکھئے کہ دیوان اردو پہنچا یا نہیں اور کلیات فارسی نواب معلی القاب کے ایماء سے طلب فرمایا گیا ہے

یا خود آپ نے اپنی طرف سے لکھا ہے۔ میرے لئے تو دونوں صورتوں میں فرمان واجب التعمیل ہوگا۔

۱۱۔ ربیع الاول ۱۲۷۸ھ

خط (۱۵۱)

نواب مختار الملک بہادر

قبلۂ حاجات دردمنداں و کعبۂ آرزوئے امید واراں۔

دردِ دل عرض کرنے سے پہلے معذرت خواہ ہوں کہ مجھ سا درویش گوشہ نشین روشناسی کے بغیر بارگاہ عالی میں عریضہ گزرانے کی جسارت کر رہا ہے۔ اگر اس حقیقت کا شناسانہ ہوتا کہ بندوں کا خداوند سے اپنی مرادِ طلب کرنا بے ادبی نہیں تو عریضہ گزراننے اور جواب کا آرزومند ہونے کی مجھے ہرگز جسارت نہ ہوتی۔ دعا اور مدّعا کو قبول کرنا یا نہ کرنا خداوند کی مرضی عالی پر ہے۔

اس سے پہلے ایک قصیدۂ مدحیہ خدمت گرامی میں روانہ کیا تھا۔ دل یہ جاننے کا آرزومند ہے کہ یہ قصیدہ مطبوعِ خاطرِ عالی ہوا یا نہیں۔ یہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ ابھی تو یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ قصیدہ نظر عالی سے گزرا بھی ہے یا راستہ ہی میں کہیں گم ہو گیا۔ پس یہ چاہتا ہوں کہ دبیران دفتر گرامی عرضداشت اور قصیدہ کے پہنچنے کی اطلاع بھیجیں اور میں اپنی قسمت کی رسائی پر ناز کروں۔

خط (۱۵۲)

سلطان محمد بہادر شاہزادہ میسور

یہ نیاز نامہ دل آرزومند کا آئینہ ہے۔ امید کہ اعلیٰ حضرت اس فلک زدہ سخن ور سے درگزر فرمائیں گے کہ روشناس نہ ہونے کے باوجود عریضہ بھیجنے کی جسارت کر رہا ہے۔ یہ اوراق جنہیں نظر والا سے گزارنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں وردِ دل کا نقش ہیں۔

دس سال کی عمر سے طبیعت میں موزونی پیدا ہوئی۔ جب ذرا سمجھ آئی تو زبان کو انداز گزارش اور قلم کو آئین نگارش ملا۔

اب میری عمر ستر برس کی ہو چکی ہے۔ پچھلے پچاس برس کی تحریروں کو مرتب کر کے میں نے چھپوایا ہے اور ایک نسخہ پارسل کے ذریعے خدمت گرامی میں بھیج رہا ہوں۔ پارسل کے پہنچنے کی اطلاع نہ ملے تو تردد رہے گا کہ خدا جانے پہنچا بھی ہے یا نہیں۔ پاس ادب مانع ہے ورنہ گزارش کرتا کہ جواب ضرور مرحمت فرمایا جائے۔

خط (۱۵۳)

جواہر سنگھ جوہر

تمہارے کئی خط ملے جن کے جواب اسی وقت لکھ کر تمہارے والد بزرگوار

کو دے دیئے تھے۔ اب یکے بعد دیگرے ۲۱ اور ۲۲ نومبر کے خط وصول ہوئے ہیں۔ پہلا خط تشویقیہ ہے اور اس میں کوئی بات جواب طلب نہیں ہے دوسرے کا جواب یہ ہے کہ مرزا عباس کا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ دوسروں کو بھی سنایا تاکہ وہ بھی خوش ہوں۔ اسے یہ خط دکھا دینا اور بہت بہت دعا کہنا۔

رائے جگمل کا خط انہیں بھیج دیا تھا۔ اسی دن شام کو وہ ہیرا سنگھ کے ساتھ آئے اور مرے نام کا خط بھی دیکھا۔ دوسرے روز اس کا جواب لکھ کر مجھے بھیج دیا جو اس خط کے ساتھ تمہیں بھیج رہا ہوں۔ موجودہ ہنگامہ میں مجھے تمہارے اور عباس بیگ کے بارے میں بڑی فکر ہے۔ خدا تم دونوں کا حامی و ناصر رہے۔

تمہیں یاد ہوگا کہ مرے پاس ایک قزلقی ٹوپی تھی۔ اسے کیڑا کھا گیا اور استعمال کے قابل نہ رہی۔ اب مجھے ٹوپی نہیں ریشمی لنگی چاہیئے جو پشاور اور ملتان میں بنتی ہے۔ جیسے وہاں کے معززین سر پر بیٹھتے ہیں لنگی کا رنگ شوخ اور حاشیہ سرخ نہ ہو اور اس پر سونے چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے نقش و نگار بھی نہ ہوں۔ ایسی لنگی درکار ہے جو سیاہ سبز، نیلے اور پیلے ریشم سے بنی ہوئی ہو۔ وہاں یہ غالباً آسانی سے مل جائے گی۔ اسے خرید کر ڈاک کے ذریعے مجھے بھیج دو اور قیمت بھی لکھ بھیجو۔ یہ مری فرمائش ہے اس لئے تمہیں اس کی قیمت مجھ سے لینی ہوگی۔ یہ نہ سمجھنا کہ مجھے تمہارا تحفہ قبول کرنے میں کوئی تامل ہے۔ مگر مرے عزیز صرف

وہ چیز ہدیہ اور تحفہ ہوتی ہے جو بے مانگے بھیجی جائے۔ بس لنگی بھیجنے اور قیمت لکھنے میں تکلف نہ کرو۔ میرا اسلام شوق رجب علی خان بہادر کو پہنچا دینا۔

خط (۱۵۴)

جواہر سنگھ جوہر

مرے نورِ چشم۔

بہت دن ہوگئے تم نے مجھے یاد نہیں کیا۔ رائے چھجمل سے تمہاری خیریت معلوم ہو جاتی ہے۔ تم نے میر اکبر علی کا کام کر دیا ہوگا۔ ان کے بارے میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ سوائے اس کے اور کیا لکھوں کہ انہیں میری جگہ سمجھو اور مجھے یقین ہے کہ تم نے ایسا ہی سمجھا ہوگا۔ تمہاری عملداری میں ایک اور صاحب غلام حیدر نامی رہتے ہیں۔ شریف خاندان کے آدمی ہیں۔ ان کے حالات تمہیں میر اکبر علی سے معلوم ہوں گے۔ ان کا بھی خیال رکھو۔ چغتائی حکمرانوں کی تاریخ کا مسودہ ہیرا سنگھ کے ذریعے روانہ کیا تھا، ابھی تک اس کے پہنچنے کی اطلاع نہیں ملی۔ اگر مل گیا ہو تو مطلع کرو ورنہ ہیرا سنگھ سے باز پرس کرو۔

خط (۱۵۵)

جواہر سنگھ جوہر

جانِ من -

تمہارا خط ملے دیر ہوئی - کوئی بات جواب طلب نہ تھی ورنہ اس سیہ روزی میں بھی جواب سے دریغ نہ کرتا - عید کی رات سے بادشاہ سلامت بیمار ہیں - آج ۲۳ شوال ہوگئی ہے - تپ و اسہال کی وہی شدّت ہے - اب دیکھئے کیا ہو اور مجھ پر جو ان کے سایۂ دیوار میں بیٹھا اونگھ رہا ہوں ، کیا گزرے - عید کا قصیدہ پڑھنے کی نوبت نہیں آئی کہ اسے چھپوا سکتا - ہیرا سنگھ تمہارے کہنے پر زین بنا رہا ہے لیکن اس کی طفلانہ حرکتیں تو دیکھو - کہتا ہے کہ میرا کل سرمایہ بارہ روپے ہے جو بڑے بھائی کا دیا ہوا ہے اور زین بنانے پر اس سے کہیں زیادہ خرچ ہوگا - مہینہ آخر ہے بھلا روپے کہاں سے دیتا - میں نے کہہ دیا کہ جب زین تیار ہو جائے تو فردِ حساب بھیج دینا - تمہارے بھائی نے جو لکھا ہے اور جو دینا طے ہوا ہے وہ دے دیا جائے گا -

---

خط (۱۵۶)

دو پنجابی دوستوں کے نام

آسمانِ شرافت کے مہر و ماہ مرزا محمد خان اور مولانا مفتی برکت اللہ کا شکر گزار

ہوں کہ انہوں نے غالب آشفتہ نوا کی تعریف فرمائی ہے۔ دوکان بے رونق کی یہ خریداری دراصل آپ دونوں کی درویش نوازی ہے۔ انسان کی صفات حسنہ بے شمار ہیں اور عدل اور فیاضی افضل ترین صفات ہیں قاطع برہان کو سراہنا آپ کے عدل اور فیاضی کی دلیل ہے۔

جب تک زندہ ہوں آپ کا ثناخواں اور عزیزی جواہر سنگھ کا دعاگو ہوں جو آپ سے تعارف کا وسیلہ بنا۔

پیر ۲۰ ذی قعد ۱۲۸۱ھ

خط (۱۵۷)

محمد آغا حسین ناخدائے شیرازی

آپ نے اس فقیر کی جو ستائش فرمائی ہے وہ آپ کی عاجز نوازی کی دلیل ہے۔ حاشا مجھے اپنے باکمال ہونے کا گمان نہیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ یہ قدر دانی نہیں بلکہ مجھ بے کمال اور علم و ہنر سے بے بہرہ آدمی کی یہ قدر افزائی ہے۔

بہرحال شکر گزار ہوں کہ قاطع برہان مطبوع خاطر عالی ہوئی۔ دانش مندانِ ہند میں یہ کتاب بیحد نامقبول ہے۔ اس کتاب کو دیکھ کر ایک بے ہنر فارسی سے ناواقف اور عربی سے نابلد شخص غصہ سے پاگل ہوگیا اور ایک کتاب لکھ ماری۔ جس میں سارا زورِ قلم صاحبِ برہان قاطع کو جودکن کا ایک

معمولی آدمی ہے۔ عالم ہمہ دان قرار دینے اور غالب کو گالیاں دینے پر صرف ہوا ہے۔ غالب کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ فرزانگان پارس کا زبان دان ہے انداز تحریر ایسا ہے جیسے ہندو ہولی میں ڈھول پیٹ کر ناچ رہے ہوں یا ہیجڑے تالیاں بجا بجا کر ہاتھ اٹھا کر کوس رہے ہوں۔

کاش ملک سخن میں کوئی میر علی شیر جیسا محتسب اور مولوی جامی جیسا مفتی ہوتا جو اس منہ زور شخص کے منہ میں لگام دیتا۔ بہرحال یہ بھی غنیمت ہے کہ سخن دانان ہوش مند اس مہمل نویس کی جہالت پر ہنستے ہیں۔

اب کہ دونوں طرف سے نامہ نگاری کی ابتدا ہو چکی ہے۔ اس سلسلے کو جاری رکھیے۔

خدا کرے باہمی اخلاص اسی طرح بڑھتا رہے۔

خط (۱۵۸)

نواب میر غلام بابا خاں

عالی جاہ۔

گرامی نامہ جان نواز ہوا۔ اللہ اللہ ایسے ہوتے ہیں دوکان بے رونق کے خریدار کہ درویش دل ریش وگوشہ نشین کو یاد کرنے میں انہیں کوئی عار نہیں ہوتا —— ! اور ہو بھی کیوں —— کبھی آفتاب ذرہ کو چمکانے سے دریغ کرتا ہے ؟ کیا ابر بہار کا فیض صرف گل ولالہ وریحان

تک محدود رہتا ہے اور خشک اور بنجر زمینیں اس سے محروم رہتی ہیں؟
امید کہ آئندہ بھی آپ مجھے اپنے مخلصان خاص میں شمار فرمائیں گے۔ سیاح جہاں گرد کے
پاؤں میں عیال داری کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔ ان کی ہر طرح مدد فرمایئے
اور پریشانیوں سے نجات دلایئے۔

والسلام ۷ مئی ۱۸۶۴ء فقط ——— ۲ـه

خط (۱۵۹)

منشی نولکشور

خدا گواہ کہ آپ سے آج تک ملاقات نہیں ہوئی مگر آپ کی محبت دل
میں گھر کر چکی ہے۔ آپ کا خط ملا تو دیدہ و دل میں تکرار چھڑ گئی۔ آنکھ سواد تحریر

ا؎ ۔ میاں داد خاں سیاح۔

۲؎ ۔ نولکشور کے تینوں اڈیشن میں فقط کے بعد اردو کے یہ فقرے چھپے
ہوئے ہیں۔ ممکن ہے غالب ہی نے خط کے آخر میں یہ فقرے بڑھا دیئے ہوں۔
"اوڑا جاؤں کیا دیوانہ ہوں۔ لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں آپ کی عنایت
سے اور بزرگوں کی دعا سے خوش و خرم ہوں اور اپنی عزت اور آبرو سے بسر کرتا
ہوں۔ خدا ایک وقت تم کو یہاں لا دے تو سب حال کھل جاوے ———
زیادہ کہنا زیادہ ہے۔ فقط"

کو سرمۂ چشم بنانا چاہتی تھی۔ اور سویدائے دل اس سے روشنی کا جویا تھا۔ میں نے دونوں میں مفاہمت کروائی، نظر کے حصّہ میں فروغ آیا اور دل کو فراغ نصیب ہوا۔ میں نے فارسی میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن اب مجھ سے مشقت نہیں ہوتی۔ میں نے آسان راستہ اختیار کر لیا ہے۔ جو بھی لکھنا ہو اردو میں لکھ لیتا ہوں۔ نہ سخن آرائی نہ خود نمائی۔ تحریر کو گفت گو بنا لیا ہے بہر حال آپ کے ارشاد کی تعمیل میں یہ خط فارسی میں لکھ رہا ہوں۔

میری فارسی نثر کی تین کتابیں ہیں۔ پنج آہنگ، مہرِ نیم روز، دستنبو آپ یہ کتابیں کہیں سے منگواتے کیوں نہیں۔ ممکن ہے اہلِ لکھنو ان کے مشتاق ہوں اب مجھے کافور و کفن سے کام ہے۔ پینسٹھ برس جی چکا ہوں۔ پچاس برس سے لکھ رہا ہوں۔ آخر ہر آغاز کا انجام ہونا ہے۔ میرا انجام بھی قریب ہے۔

ششماہی چندہ کے عوض مہینے میں چار بار اودھ اخبار بھیجا جا سکتا ہو تو مجھے خریداری منظور ہے۔

میاں داد خاں سیاح کو دعا کہیئے۔ میں نے ایک دوست سے کہہ رکھا ہے کہ چند فارسی غزلیں نقل کر دیں۔ جب آ جائیں تو آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا

جولائی ۱۸۶۰ء

خط ــــ (۱۶۰)

خاتمہ پنج آہنگ

اللہ جانتا ہے اور اہل نظر جنہیں اس نے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی ہے وہ جانتے ہیں کہ غالب گنہگار نے عربی آمیز فارسی انشاء کے دشوار گزار راستے کی کس دلاویز انداز سے رہنمائی کی ہے۔ آج میری عمر اڑسٹھ برس کی ہو چکی ہے اس کا ایک جزو کھیل کود میں اور کُل پچاس برس سخن طرازی میں گزرے جس میں نثر میں بھی نظر فروز روش اختیار کی۔ پچھلے دو برس سے اس فکر میں تھا کہ اپنی نگارشات کو مرتب کروں اور مزید خامہ فرسائی اور خود نمائی کو چھوڑ کر انہیں اہل نظر کی خدمت میں پیش کروں

اب کہ ۱۲۸۰ھ ہے، روشن دل روشن طبع صاحب مہر و مُروّت منشی نولکشور نام آور کا اس ویرانے میں جس کا نام شاہ جہاں آباد ہے گزر ہوا اور وہ از رہِ درویش نوازی غریب خانہ پر تشریف لائے۔ میں نے اس ملاقات کی شادمانی پر اپنے آپ کو مبارکباد دی۔

برادرِ ہمایوں فر نواب ضیا الدین خاں، آسمانِ عزّ و جاہ کے نیّرِ رخشاں اور اوج سروری میں آفتاب ذرّہ پرور ہیں۔

بدین ودانش و دولت یگانۂ آفاق

بہ عمر کہتر و از روئے رتبہ مہتر من

اگرچہ اوست ارسطو و من فلاطونم

بود بہ پایہ ارسطوئے من سکندر من

منشی نولکشور میری نثر کا مجموعہ جس میں یہ صحیفہ (پنج آہنگ) بھی شامل ہے نواب ضیاالدین خاں سے مستعار لے کر اپنے ساتھ لکھنؤ لے گئے تاکہ اس کلام نامطبوع کو زیور طباعت سے آراستہ کریں۔

اہل نظر سے مخفی نہ رہے کہ ابجد کے اعتبار سے لفظ 'جزد' کے ۱۶ اور 'کل' کے ۵۰ عدد ہوتے ہیں۔ اس میں دو برس ملایئے تو اٹھارہ ہوتے ہیں۔ اس طرح ۱۶ برس لڑکپن کے اور پچھلے دو برس یعنی اٹھارہ برس کو چھوڑ کر کل پچاس برس نغمہ سرایانِ پارس کی رَوِش پر نغمہ سنجی کرتا رہا۔ اب اس رَوِش کو ترک کر کے یاران نزدیک و دور کو جو کچھ لکھنا ہو وہ اردو زبان میں لکھوں گا وہ بھی سرسری اور تکلف سے بری تاکہ زندگی آسان گزرے۔

غالب مریدم از ہمہ خواہم گزیں سپس

کنجی گزینم و بپرستم خدائے را

اشتہار مثنوی پنج آہنگ

مژدہ اے رہروانِ راہِ سخن
پایہ سنجانِ دستگاہِ سخن

طے کرو راہِ شوق زود از زود
آن پہنچی ہے منزلِ مقصود

پاس ہے اب سوادِ اعظمِ نثر
دیکھئے چل کے، نظمِ عالمِ نثر

سب کو اس کا سواد ارزانی
چشمِ بینش ہو جس سے نورانی

یہ تو دیکھو کہ کیا نظر آیا
جلوۂ مدعا نظر آیا

ہاں یہی شاہراہ دہلی ہے
مطبعِ بادشاہِ دہلی ہے

منطبع ہو رہی ہے پنج آہنگ،
گل و ریحان و لالہ رنگا رنگ

ہے یہ وہ گلشن ہمیشہ بہار
بارور جس کا سرو، گل بے خار

نہیں، اس کا جواب، عالم میں
نہیں ایسی کتاب عالم میں

اس سے انداز شوکتِ تحریر
اخذ کرتا ہے آسماں کا دبیر

مرحبا طرزِ نغز گفتاری
حبذا رسم و راہِ نثاری

نثر مدحت سرائے ابراہیم
ہے مقرر جواب بے تعلیم

اس کے فقروں میں کون آتا ہے
کیا کہیں، کیا وہ راگ گاتا ہے

تین نثروں سے کام کیا نکلے
ان کے پڑھنے سے نام کیا نکلے

ورزشِ قصہ کہن کب تک
داستانِ شہ دکن کب تک

تا کجا درسِ نثر ہائے کہن
تازہ کرتا ہے دل کو تازہ سخن

تھے ظہوری و عرفی و طالب — اپنے اپنے زمانے میں غالب
نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے — اسد اللہ خاں غالب ہے
قول حافظ کا ہے بجائے دوست — "ہر کرا پنج روز نوبت اوست"
کل وہ سرگرم خود نمائی تھے — شمع بزم سخن سرائی تھے
آج یہ قدر دان معنی ہے — بادشاہِ جہانِ معنی ہے
نثر اس کی ہے کارنامۂ راز — نظم اس کی نگار نامۂ راز
دیکھو اس دفتر معانی کو — سیکھو آئینِ نکتہ دانی کو
اس سے جو کوئی بہرہ ور ہوگا — سینہ گنجینۂ گہر ہوگا
ہو سخن کی جسے طلب گاری — کرے اس نسخے کی خریداری
آج جو دیدہ ور کرے درخواست — تین بھیجے روپے وہ بے کم و کاست
منطبع جبکہ ہو چکے گی کتاب — زر قیمت کا ہوگا اور حساب
چار سے پھر نہ ہو گی کم قیمت — اس سے لیویں گے کم نہ ہم قیمت
جس کو منظور ہو کہ زر بھیجے — احسن اللہ خاں کے گھر بھیجے
وہ بہار ریاضِ مہر و وفا — جس کو کہتے ہیں عمدۃ الحکماء
میں جو ہوں در پئے حصول شرف — نام عاصی کا ہے غلام نجف
ہے یہ القصہ حاصل تحریر — کہ نہ ارسالِ زر میں ہو تاخیر
چشمۂ انطباع جاری ہے — ابتدائے ورق شماری ہے

تاریخِ اشاعت

از : حفیظ ہوشیارپوری

لباس اُردو کا پہنا تو ہوا اور — پُر از نقش و نگار "آہنگِ پنجم"

اگر درکار ہے سالِ اشاعت — کہو "باغ و بہار آہنگِ پنجم"

۱۳۸۸ھ

اشاریہ

رجال

ابراہیم ۱۹۰
ابوالقاسم خاں، مرزا ۵۱، ۵۷
ابوظفر بہادر (ولی عہد) ۵۹
احترام الدولہ بہادر ۱۶۰
احسن اللہ خاں، حکیم ۱۳۴، ۱۹۱
احمد، مرزا ۴۵
احمد بخش، نواب د، ج
۱۴، ۱۷
احمد بیگ خاں، مرزا ۴۲، ۵۱
۵۳، ۵۷، ۵۸، ۶۲
احمد حسین، مرزا ۱۶۵
احمد خاں، نواب ۱۷
ارسطو ۱۹، ۱۳۷
ازادول ۱۵۰
اسٹرلنگ، اندور ۴، ۳۸
۵۰، ۵۶، ۸۴
اسد بیگ ۳۰
اسفندیار بیگ خاں، مرزا ۱۴۵
اسکنر، کرنل ۱۰۴
اعتقاد الدولہ ۱۲۹

اعظم علی، میر ۸
افراسیاب ۶۷، ۱۳۸
افصح، مرزا حیدر علی ۳۲
افضل بیگ خاں، مرزا ۴
۳۹، ۴۰
اکبر خاں ۱۲۴، ۱۲۵
اکبر علی، نواب ۵، ۴۷، ۱۸۲
التفات حسین خاں، منشی
۵، ۱۰۵
الف بیگ ۱۸
امام علی، میر ۲، ۳، ۱۰۶
امجد علی خاں، مرزا ۷۰
۱۶۰، ۱۵۷
امداد حسین خاں ۱۳۶
امداد علی، میر ۱۶، ۱۳۲
املاک، ہنری ۵۶
امیر حسن خاں ۱۳۰
امین الدین احمد خاں، فخر الدولہ نواب
۱۰، ۱۴
۴۴، ۴۷، ۵۵، ۱۰۴
امین اللہ خاں ۱۱۳، ۱۳۵

اندرجیت
انسبرا، لارڈ
انوار الدولہ بہادر
انور الدین، مرزا
آتش، خواجہ حیدر علی
آزردہ، مفتی صدرال

آصف ثانی
آغا حسین، محمد
آغا میر معتمد الدولہ
آک لینڈ، لارڈ
آلِ حسن، مولوی
باقر، مولانا
بخش الدین مارہروی
بدر الدین
برکت اللہ، مولانا مفتی
بسمل، امیر حسن خاں
بشیر الدین میسوری
بکرماجیت، راجہ
بلیک
بو علی سینا

بننگ لارڈ کونڈرس ۳۱، ۴۶، ۵۴، ۶۲، ۸۷، ۱۱۸
بہزاد ۱۴۹
بسلی، ولیم ۸۷
پاٹن صاحب ۸۴
پرویز ۱۳۵، ۱۵۹
پشنگ ۶۷
ٹامسن جیمس ۱۲۵، ۱۰۸
تپان، مرزا احمد بیگ خاں ۱۷
تپش، مرزا جاں ۱۷
تجمل حسین خاں ۱۴۲
تراب علی ۳۱
تفتہ، مرزا ہرگوپال م، ۱۳۸، ۱۴۱
جامی، مولوی ۱۸۵
جان لارنس ۱۶۶
جلیل الدین خاں، مولوی ۶۲
جمشید ۱۳۵، ۱۵۹
جمنا داس ۴۸، ۴۹
جیکب میجر جان ۸۹ تا ۹۳
جوہر، جواہر سنگھ ۷۴، ۱۲۰، ۱۸۰ تا ۱۸۴
جھجھل کھتری رائے ۶۹، ۷۴، ۱۸۱، ۱۸۲
حامد علی خاں، میر ۴۷، ۵۱، ۵۳
حبیب اللہ، محمد ۱۷۷
حزیں، شیخ علی ل، ۱۵۸
حسام الدین حیدر خاں، مبارز الدولہ نواب ک، ۴۶، ۷۳، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۶۷ تا ۱۷۱
حسن علی، منشی ۴۷
حشمت جنگ بہادر، نواب ۱۳۲
حفیظ ہوشیارپوری ۱۹۳
حمید الدین خاں، محمد ۶۴، ۱۰۷
حیدر خاں، سید سیف الدین ۱۵۴
حیدر خاں عرف حسین مرزا، ذوالفقار ۱۰۴
حیدر شکوہ، مرزا ۱۶۵
حیدر کرارؓ ۱۷۵
خاور، مرزا ۱۶۳
خضر ۱۲، ۱۳
خلیل الدین، مولوی محمد ک، ۱۱۷
خلیل الرحمان داودی ۵
دارا ۱۶۰
دوندی خاں ۴۷
ذوالفقار، نواب ۱۰۳
ذوق، شیخ محمد ابراہیم ۱۲۵، ۱۶۶
رام سنگھ، راجہ ۱۶۴
رجب علی خاں، مولوی ۱۵۱، ۱۶۳، ۱۸۲
رحمت اللہ خاں، منشی ن، ۱۴۸
رضی الدین حسن خاں، حکیم د، ۱۰۷، ۱۰۸
روح اللہ خاں ۱۶۱
زیب النسا بیگم ۷۴

زین العابدین خاں، مرزا ۳۰
سائمن فریزر ۸۴
سبحان علی خاں ۱۰، ۱۱، ۱۹، ۷۸، ۹۴
سبط حسن ف
سحابی، مولانا ۱۲۰ تا ۱۲۲
سراج الدین احمد، مولوی م، ۲۲، ۲۶، ۳۶ تا ۶۵
سرور، شیخ امیر اللہ ۳۰
سرور، نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں ۱۷
سعادت حسین، مولوی ۱۰۳
سکندر ۱۲، ۱۳، ۶۶، ۱۶۰
سلطان محمد بہادر، شہزادہ ز
سلیمان ۱۳۶، ۱۳۷
سودا، مرزا محمد رفیع ل
سوئنٹس، جارج ۴۰، ۵۶
سوہن لال، راجہ ۷۳، ۷۴
سیاح، میاں داد خاں ۱۸۶، ۱۸۷
سید علی، میر ۲۹
سید محمد، مولوی ۴۷
سیف الدین خاں، نواب مظفر الدولہ ۳۳، ۱۵۴، ۹۶
شفق، انوار الدولہ نواب محمد سعد الدین خاں ع، ۱۳۷، ۱۴۶، ۱۵۶، ۱۵۹
شمس الدین خاں، نواب د
شمس الامرا ۱۱۱
شہرت، مرزا حاجی س، ۱۶۵
شہید، غلام امام ۲۷
شیریں ۱۵۹
شیفتہ، نواب مصطفیٰ خاں ک، ۶، ۱۲، ۱۳، ۱۶، ۱۷، ۲۵، ۲۷، ۳۰، ۳۳ تا ۳۴، ۹۸، ۱۱۹ تا ۱۲۱، ۱۲۳، ۱۳۱
شیو نرائن، منشی و، ۵
صاحب رام، راجہ ۹۴
صاحب عالم مارہروی و، ۱۴۳، ۱۴۴
صادق خاں، محمد قاضی ۶۴
صائب ل، ۱۵۸
صدر الدین خاں بہادر، صدر الصدور، مولوی محمد ۶، ۳۰، ۱۱۹
صفات علی خاں، میر ۸۹
صہبائی، امام بخش ۱۲۱، ۱۲۵
ضمیر، مولانا ۱۷۴
ضیاء الدین احمد خاں، نواب ۱۰، ۱۱۰، ۱۱۵، ۱۲۱، ۱۸۸، ۱۸۹
طالب ۱۹۱
طالب آملی ۱۲۱، ۱۲۲
طالع یار خاں ۹۰، ۱۰۱
ظفر، بہادر شاہ ن
ظفر الدولہ ۱۶۷
ظہوری ۱۹، ۱۹۱
ظہیر الدین خاں، خواجہ ۱۵۱، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۶۴
عابد علی خاں ۱۵۴
عارف، زین العابدین خاں ۱۱۵، ۱۲۰

ی خاں، منشی
۸۸، ۱۲۸
ـہ، مرزا ۱۸۱
بریلوی، قاضی ۱۵۳
۲۵
ی، مولانا ۱۱۱
سولوی حافظ ۱۵۴
یمولوی ۲۳
، مولوی کاظم ۸۷
بیگ خاں، مرزا ۶۸
خاں، نواب ۱۴۴
۱۵۶
ب لکھنوی
۱۷۱
م پوری ح
ک، ۷۶
۱۵، ۱۲۱، ۱۵۸، ۱۹۱
ت عالی، میرزا ۱۶۵
خاں، نواب سید
۱، ۱۳، ۸۳، ۸۷
۸۸

علی اکبر شیرازی، مولانا ۲۴
علی بخش خاں، مرزا ج
د، و، ی، ۳، ۱۷
۱۳۲
علی بہادر، نواب ل
ع، ۱۵۷
علی خاں، امین الدولہ آغا
۹۹، ۱۰۰
علی خاں عرف حضرت
جی، میر سید ۱۰۰
علی سوداگر، مرزا ۷۴
علی شیر، میر ۱۸۵
علیم اللہ، شیخ ۴۹
غلام بابا خاں،
نواب میر ۱۸۵
غلام حیدر ۱۸۲
غلام علی خاں ۱۳۲
غلام فخر الدین د
غلام نجف ۱۹۱
غیاث الدین خاں،
حافظ ۱۶۱

فاضل بیگ، مرزا ۳۰
فتاح ۱۲۲
فتح اللہ بیگ ۷۷
فتح اللہ خاں ۴۸، ۴۹
فتح علی خاں ۱۶۷
فرانسس ہاکنس ۳۸
فرہاد ۱۵۹
فریزر، ولیم ۶۰، ۷۷
فضل اللہ خاں، منشی
۱۱۳، ۱۳۴
فضل حق، مولوی
حافظ محمد ۲۴، ۵۹
۶۰، ۷۳، ۱۱۴
فضل علی خاں،
اعتماد الدولہ ۴۷
فضل مولیٰ خاں، میر ۴
فیض محمد خاں، نواب
۴۷، ۵۹
قادر بخش، حافظ ۱۰۲
قاسم علی خاں، سید
۱۵، ۱۶۱

قتیل، محمد حسین تبریزی ١٨
قتیل فرید آبادی،
محمد حسین ١٨
قربان بیگ، مرزا ١٦٥
قطب الدولہ ١۴٧
قلق، مولانا امجد علی ١٥٠
کرم حسین خاں، مولوی ١٠، ١١
کرم علی، میر ١٣٢
کریم بخش، حافظ ١٠٢، ١٠٣
کریم خاں ٢٣، ٧٩
کوبرک، سر اڈورڈ ٥٦، ٨٦
لیک، لارڈ ٦٨
مالکم، سر جان ٣٩
مانی ١۴٩
مبارز الدولہ ١٦٧
مجروح، میر مہدی ل، س
محلدار خاں ١٧٠
محمد اکرام، شیخ ط، ی
محمد بخش، منشی حافظ ١٦٠
محمد بہادر، سلطان ١٨٠
محمد آغا ٥٧

محمد حسن، منشی ک، ٨٧
٩٦ تا ٩٧، ٩٨
محمد حسین خاں، میر د
محمد خاں، نواب سید ١٥١
١٥٧، ١٦٠، ١٨٣
محمد سعید خاں، نواب ١۴٥
محمد سلیمان شکوہ بہادر،
مرزا ١٥
محمد صادق، قاضی ٦٧
محمد عباس بھوپالی، مولانا
ی، ١٧٦
محمد علی خاں ٣٦، ٨٠
٨٢ تا ٨٨، ١٠٣، ١٠٨
١٣٦، ١٧٢
محمد محسن ۴٧، ٦١، ٩٦
محمد نجف ٦۴، ١٠٦
محمد، غلام حسن خاں ١١٩
محوی ١٦٥
مختار الملک بہادر،
نواب ١٧٩
مداری خاں ٣

مرزا (محمد رفیع سودا) ١٥٨
مسیح ٢۴
مسیح الدین خاں،
مولوی محمد ١٣٠
مظفر حسین خاں ١١٥، ١٢٧
معین الدین خاں،
خواجہ ١٥٦
معین الملک ٦٧، ١٣٨
مغل، میرزا ٨١
مکناٹن، ولیم ٦٠
ممنون، میر نظام الدین ١٢١
منا (حقہ بردار) ٣
منیر الدین خاں خواجہ ١٥٩
موسیٰ جان، میر ٢١، ٢٢
مومن، مومن خاں ٣٢
مہاجر، محمد عمر ع، ث
مہدی، میر ١٦۴، ١٦٥
مہر، مرزا حاتم علی ٢٧٢
مہر، مولانا غلام رسول و، م
میر، میر تقی ل، ١٥٨

نبی بخش، میر احمد حسین ۱۴۲
نادر حسین خاں ۱۵۷، ۱۶۱
ناسخ، شیخ امام بخش ۱۴، ۲۰، ۳۲، ۷۶، ۷۹
نادر شاہ ۵۳
ناطق مکرانی، گل محمد خاں ن، ۲۳، ۱۲۴
نبی بخش، منشی ۱۳۹، ۱۴۰
نجف خاں، ذوالفقار الدولہ میر ۶۷
نساخ، عبدالغفور ۱۷
نصر اللہ بیگ ۶۸
نصر اللہ، منشی ۵۶
نظام الدین، نواب حافظ ۱۵۰، ۱۵۶، ۱۵۷
نظیری ک، ۱۵۸
نور الحسن، مولوی ۲۲
نور الحسین ۲۲، ۲۶
نور الدین، منشی و
نور الدین علی خاں، سید ۱۰۳
نوروز علی خاں ۹۵
۹۷، ۱۱۶
نولکشور، منشی ز، و، ح، ک، ۱۸۶، ۱۸۸، ۱۸۹
نیر ۱۲۴
نیر رخشاں، نواب ضیاء الدین خاں ز، ۵
واجد علی خاں، سید ۵۸، ۱۴۲
وحید الدولہ بہادر ۱۶۱، ۱۶۲
واقف، نور العین ۱۸
وحشی، ملا ن، ۱۴۸
وزیر علی، میر ۱۰
ولایت حسین خاں، مولوی ۲۸، ۳۵، ۸۵، ۸۶، ۸۸
ہاکنس ۶۰
ہرچندر، لالہ ۱۰۴
ہمایوں، نصیر الدین ۱۶۴
ہمزہ بیگ ۱۹
ہنری املاک، کرنل ۵
ہنری لارنس ۱۶۶
ہیرا لال وکیل، لالہ ۵، ۴۲، ۱۸۰
ہیرا سنگھ ۱۸۱، ۱۸۲
یوسف، حضرت ۱۳۹
یوسف مرزا ۱۷۱

کتب و رسائل

اردوئے معلیٰ ت
اودھ اخبار ۱۸۷
آئینہ سکندر ۴۵، ۵۵، ۵۹، ۶۰، ۶۲
برہان قاطع ۱۸، ۱۸۴
بہار عجم ۷۸
بزم جاوید بہار ۱۱۱
تذکرہ عمدہ منتخبہ ۱۷
تفسیر سورہ (غاشیہ) ۱۶۳
تفسیر سورہ والفجر ۱۶۴
جام جہاں نما ۴۶
حیات غالب ط
خطوط غالب و
دستنبو ز، ۱۶۳

۱۷۴، ۱۷۸، ۱۸۷
دیوان اردو ۹۳، ۱۰۰
۱۷۳، ۱۷۷، ۱۷۸
دیوان حافظ ۸۹
دیوان ریختہ ۵، ۱۴
دیوان نظامی ۱۲۴
زبدۃ الاخبار ۹۳
سید الاخبار ۹۳
فرہنگ ۱۸
قاطع برہان ۱۸۴
قانون ۱۵۸
کلیات فارسی ۱۷۳، ۱۷۸
کلیات نثر فارسی ز
کلیات نظم فارسی ۵
گل رعنا ۱۸
گلشن بے خار ۱۳، ۱۷
ماہ نو، کراچی ح
ماہ نیم ماہ ۱۷۸
متفرقات غالب ح، ع
مجموعۂ نثر غالب اردو
۵، ۹
مجموعۂ نظم فارسی ۱۷۸
مولد ہمایوں ۱۵۹
مہر نیم روز ۴، ز، ۱۷۳
۱۷۸، ۱۸۷
میخانہ آرزو د

مقامات

اجمیر ۳۱
اکبر آباد ۶۸، ۱۰۸
۱۳۵، ۱۳۹، ۱۴۰
آگرہ ۱۱، ۱۷۱
الہ آباد م، ۲۹، ۵۲
۶۴، ۷۸، ۸۱
۱۰۲، ۱۱۸
الور ۱۱۳، ۱۴۵، ۱۴۶
انگلستان ۱۱۸
اودھ م، ۱۰، ۱۱
۱۱۸، ۱۲۶
ایران ۳۳، ۵۳، ۶۵
۷۶، ۱۸۵
باندہ ع، ۵۷، ۸۰
۸۸، ۱۰۳، ۱۵۷
برما ۸۷
بغداد ۱۴۳
بنارس م،
۸۳، ۱۰
بندیل کھنڈ ۸۰
بنگال ۸۱
بھرت پور ج
پارس دیکھیے ایران
پانی پت ۱۶
پٹودی ۱۴۳
پشاور ۱۸۱
تاج محل ۴۶
ترکستان ۱۳۸
جمنا دریا ۸۱
جہانگیر آباد ۱۶
جے پور ۱۷، ۱۴۴، ۱۷۱
جھنجھر ۴۷
جھرکا ج
چلہ تارا ۸۰، ۸۱
حیدر آباد ۱۱، ۱۷۷
خراسان ن

دکن ۱۸۴

دہلی ز، س، ۲۰، ۳۰

۵، ۹، ۱۷، ۳۱

۳۹، ۴۷، ۵۱، ۵۴

۵۷، ۵۹، ۶۰، ۶۱

۷۵، ۷۷، ۸۵، ۸۶

۹۸، ۱۰۱، ۱۰۳، ۱۳۲

۱۴۹، ۱۴۷، ۱۵۰

راجستھان ۱۶۶

سمرقند ۶۷

شاہجہاں آباد ۶۸، ۱۸۸

شاہدرہ ۱۰۲

شملہ ۴۶

شملہ بازار ۴، ۷۴

شیخوپورہ ۶۴

شیراز ۹

عظیم آباد ۸۷، ۸۳

علی گڑھ ۱۳۰

فتح پور ۸۰

فرخ آباد ۱۳۲

۴۶، ۱۷۱

فیروزپور ج، ۳، ۳۸

۶۹، ۷۷، ۷۹، ۱۱۸

قلعہ آگرہ ۴۶

کانپور ۷۲، ۹۶، ۱۰۰

کلکتہ ط، ی، م، ۱

۳ تا ۵، ۹، ۱۴، ۱۷

۲۲، ۳۷، ۴۲، ۴۴

۴۵، ۴۹، ۵۱ تا ۵۳

۵۵، ۵۷، ۵۸، ۶۲،

۷۲، ۷۳، ۷۹، ۸۱

۸۲، ۸۳، ۸۷، ۹۵

۱۰۱، ۱۰۹، ۱۲۷

کول ۱۳۹، ۱۴۰

گوالیار ۹۰، ۱۰۱

لاہور ۴۶، ۷۶، ۱۰۲

۱۰۳، ۱۳۸

لکھنؤ ز، م، ۲۶، ۲۷، ۳۲

۷۱، ۷۲، ۸۷، ۹۴،

۹۶، ۱۳۲، ۱۴۸، ۱۴۹

۱۶۱، ۱۷۱، ۱۸۷، ۱۸۹

نوٹرو ج، ۵

لندن ۱۰۱

مارہرہ ۱۴۳

مالدہ ۸۷

متھرا ۱۳۹

مرشد آباد ۸۱

ملتان ۱۸۱

موٹرہ ۸۰

میرٹھ ۱۴۴

میسور ۱۸۰

مہورت ۳۹، ۶۰، ۷۹

ہوگلی بندر ۱، ۸۳

ہندوستان ۳۴، ۵۳

۷۶، ۱۳۸، ۱۵۰

ادارے

ادارہ یادگار غالب ف

بادشاہی چھاپہ خانہ و

فورٹ ولیم کالج ط

مجلس ترقی ادب لاہور ہ

مدرسہ اکبرآباد ۸

مطبع دارالسلام دہلی و

مطبع سلطانی دہلی و

نولکشور پریس و، ز، ۱۴۸

پوچھتے ہیں وُہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

ادارۂ یادگار غالب جنوری ۱۹۶۸ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس ادارے کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں:

(۱) غالب کی شعری اور نثری تخلیقات کی اشاعت (۲) اُن تخلیقات کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنا (۳) غالب اور دوسری ادبی ہستیوں کی شخصیت، تخلیقات اور ان کے عہد کے بارے میں علمی تحقیق و تفتیش کی سہولیتیں فراہم کرنا (۴) ہر سال یوم غالب منانا (۵) ایک ادبی رسالہ شائع کرنا اور (۶) غالب شناسی کے فروغ کے لئے دیگر ادبی و علمی اداروں سے تعاون کرنا۔

مئی ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی کی تقریبات کے موقعہ پر ادارے کی جانب سے مندرجہ ذیل چھ کتابیں شائع کی گئی ہیں۔

(۱) دود چراغ محفل۔ پیر حسام الدین راشدی (۲) غالب — سب اچھا کہیں جسے۔ پروفیسر کرارحسین (۳) پنج آہنگ۔ آہنگ پنجم کے فارسی خطوط کا ترجمہ۔ محمد عمر مہاجر (۴) بزم غالب۔ عبدالرؤف عروج (۵) غالب کا منسوخ دیوان مسلم ضیائی (۶) غالب نما۔ کتابوں اور رسائل کا اشاریہ۔ ابن حسن قیصر۔

ادارۂ یادگار غالب جنوری ۱۹۶۸ء میں قائم کیا گیا تھا - اس ادارے کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں:

(۱) غالب کی شعری اور نثری تخلیقات کی اشاعت (۲) ان تخلیقات کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنا (۳) غالب اور دوسری ادبی ہستیوں کی شخصیت، تخلیقات اور ان کے عہد کے بارے میں علمی تحقیق و تفتیش کی سہولتیں فراہم کرنا (۴) ہر سال یوم غالب منانا (۵) ایک ادبی رسالہ شائع کرنا اور (۶) غالب شناسی کے فروغ کے لئے دیگر ادبی و علمی اداروں سے تعاون کرنا -

مئی ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی کی تقریبات کے موقعہ پر ادارے کی جانب سے مندرجہ ذیل چھ کتابیں شائع کی گئی ہیں -

(۱) دود چراغ محفل - پیر حسام الدین راشدی (۲) غالب — سب اچھا کہیں جسے - پروفیسر کرار حسین (۳) پنج آہنگ - آہنگ پنجم کے فارسی خطوط کا ترجمہ - محمد عمر مہاجر (۴) بزم غالب - عبدالرؤف عروج (۵) غالب کا منسوخ دیوان مسلم ضیائی (۶) غالب نما - کتابوں اور رسائل کا اشاریہ - ابن حسن قیصر -